پھانے

اور چند دیگر افسانے



قمر سبزواری

پھانسے

افسانوی مجموعہ

از

قمر سبزواری

فہرست

تقریظ

قمر سبز واری کے افسانے موضوع کے اعتبار سے اپنا اسلوب خود گھڑ ھتے ہیں یہ افسانے کبھی نرم نرم انگلیوں سے نشتر لگاتے ہیں تو کبھی سخت کھر درے ہاتھوں سے جھنجھوڑتے ہیں. قمر سبز واری کی دوررس نگاہیں جب عورت کی داخلیت میں اترتی ہیں تو نجمہ اور حرافہ کی شازیہ کی بازیافت ہوتی ہے . نجمہ اور شازیہ نفسیات کی تنی ڈور کے الگ الگ سرے پر کھڑی ایک دوسرے کی بدل معلوم ہوتی ہیں. مرد اساس سماج میں عورت کی زبوں حالی پر قمر سبز واری نے نیے زاویے سے روشنی ڈالی ہے۔

شموئیل احمد

قمر سبز واری کے غیر معمولی افسانے

قمر سبز واری کے افسانوں کا مجموعہ "پھانے" میرے سامنے ہے۔ میں جب اس مجموعے کی کہانیاں پڑھ رہا تھا تو مجھے رہ رہ کر اشفاق احمد سے اپنا ایک مکالمہ یاد آ رہا تھا۔ یہ گفتگو اب اکادمی ادبیات پاکستان سے چھپنے والی "پاکستانی ادب کے معمار" کے سلسلے کی کتاب میں شامل ہے۔ یوں تو جنس لگ بھگ قمر سبز واری کی ان سب کہانیوں میں بہ طور موٹیف آئی ہے اور جہاں جہاں آئی ہے ماننا ہو گا کہ خوب سلیقے سے آئی مگر "رکھوالی" اور "حرافہ" جیسی کہانیوں پر اشفاق احمد والی گفتگو یاد آ گئی تو غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ ان کہانیوں میں جنس کے علاوہ اگر کوئی اور موضوع ہے تو وہ ضمنی ہو گیا ہے۔ ہاں تو گفتگو کا وہ حصہ جو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں، وہ یوں ہے کہ میں نے اشفاق احمد سے ایک تلخ سوال پوچھ لیا تھا۔ اس سوال پر پہلے تو مجھے ہک دک دیکھتے رہے، ذرا سا برہم ہوئے اور پھر اس کے جواب کی طرف آ ہی گئے۔ نہیں صاحب، یوں نہیں، اشفاق احمد کو بات کہنے کا ڈھنگ آتا تھا اور لطف بھی اسی میں ہے کہ میں عین مین ان ہی کے لفظوں میں ان کی بات مقتبس کر دوں۔ پہلے وہ سوال، جو میں نے جی کڑا کر کے یوں داغ دیا تھا جیسے کوئی اناڑی آنکھیں بند کر کے گولی داغتا ہے۔ میرا سوال تھا "اشفاق صاحب، کیا ایسا نہیں ہے کہ آپ کے ہاں جب (تصوف والے) بابے آئے، اُس وقت تک جنس کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا تھا۔ اس میں مزید چونکانا مشکل تھا، جب کہ آپ کے ہاں لوگوں کو فوراً

اپنی طرف متوجہ کرنے کی خواہش موجود تھی۔ آپ نے تصوف کا سہارا لیا" وغیرہ وغیرہ۔ اشفاق احمد کا جواب تھا، "شاید ایسا ہی ہو۔ کچھ لوگ یوں ہی کہتے ہیں۔ لیکن میرا ذاتی مشاہدہ یہ ہے کہ جنس سے انسان، خاص طور پر مرد کبھی نہیں تھکتا۔ وہ اس میں کافی دور تک چلا جاتا ہے اور دیر تک رہتا ہے۔" پھر انہوں نے اپنے بابوں کے فلسفے کی وضاحت کی اور آگے چل کر یہ کہا تھا کہ " جنس ایک بڑی طاقت ور اور پاکیزہ چیز ہے، یہ میری تخلیق کا باعث ہے۔ دیکھیں جی، میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں، یہ جنس اس کے پیچھے کارفرما تھی تو میں تشریف لے آیا ہوں، لہذا میں اس کا احترام کرتا ہوں۔" تو صاحِب، یہی محترم ہو جانے والی، طاقت وار اور پاکیزہ جنس ،ہمارے دوغلے اور گھٹن کا گھن لگے معاشرے میں کیسے انسانی نفسیات کا ناس مار کر اسے کھوکھلا کرتی ہے اور کیسے معاشرتی اکھاڑ پچھاڑ سے محبت کی فصل اجاڑ دیتی ہے، قمر سبز واری کے افسانوں میں بہ طور خاص موضوع ہوئی ہے۔

قمر سبز واری نے لگ بھگ اپنی ساری کہانیوں کے پلاٹ ہمارے ارد گرد کی معاشرت سے لیے ہیں۔ یہ وہ زندگی ہے جو ہم جیتے ہیں لہذا کوئی بھی کہانی ہمیں اجنبی یا انوکھی نہیں لگتی، تاہم یوں ہے کہ ان کہانیوں کے کردار سیدھی اور صاف زندگی کرنے پر قادر نہیں ہیں لہذا ایک ٹیڑھ اور عیب لے کر آتے ہیں۔ مثلاً اس مجموعے کی کہانی "رکھوالی" ہی کو لیجئے، اس میں رشیداں کا خاوند ملک سے باہر ہے اور وہ ان عورتوں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہے جو بیوہ ہو جاتی ہیں۔ چھتیس سال کی شاہدہ کا خاوند دو سال پہلے فوت ہو گیا تھا، اس کی ساس اندھی ہے، نند پاگل اور اسے دو بیٹوں کو پالنا ہے۔ رشیدہ ہو یا شاہدہ، عترت ہو یا نرگس سب مجبور ہیں کہ

انہیں اپنے اپنے مرد کے بچوں اور ان کی ماں یا بہن کی رکھوالی کرنا ہے یا بدن سمیٹ کر اس کے اندر جنس کو دبا کر رکھنا ہے۔ اپنے بدن کے مطالبوں سے بے نیاز ہو کر زندگی نہیں گزاری جاسکتی کہ بدن کے اندر جنس یوں بھڑکتی ہے جیسے تندور میں آگ۔ سو، ایسی عورتوں کا ہمارے معاشرے میں انجام قتل ہونا ہوتا ہے اور یہ قتل بالعموم کوئی اور نہیں کرتا، اپنی ہی کوکھ کے جنے ہوئے کر دیا کرتے ہیں۔

"ہارمون" اگرچہ ایک مرد کی کہانی ہے مگر صاحب یہ مرد بھی کہاں رہا ہے۔ ہارمون کی گڑبڑ نے اسے مرد رہنے دیا ہے نہ عورت تب ہی تو استاد صاحب نے اسے آسان شکار سمجھ کر کمر پر ہاتھ پھیرا اور اوندھا لیا تھا۔ ابا اسے مضبوط مرد بنانا چاہتے تھے مگر جس کی عادتیں ہیجڑوں جیسی ہوں وہ مرد کیسے بن سکتا تھا۔ ایسے افراد ہمارے معاشرے میں رسوائی اور ذلت کا نشان ہو جاتے ہیں حالاں کہ ایسا بن جانے میں ان کا قصور نہیں ہوتا۔ اس افسانے کے اس کردار کو اپنا گھر، اپنا شہر اور اپنا ملک چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ اب وہ امریکہ میں ایک پارٹنر کے ساتھ رہتا ہے، جہاں ہم جنس ہو جانے پر کسی کو اعتراض نہیں مگر وہ وہاں رہ کر بھی وہ وہاں کہاں رہتا ہے کہ اسے اب ماں یاد آتی تھی۔ ماں، جس کی دیوار پر لگی تصویر پر وہ انگلیاں پھیر کر ماں کے پاس پہنچ جایا کرتا ہے۔

"حرافہ"، عورت سے کہیں زیادہ خبیث مرد کا افسانہ ہے۔ ایسے خبیث مرد کا افسانہ جو عورت کو غلیظ ناموں سے پکار کر، اسے اکساتا اور اپنی جنسی آگ بھڑکاتا ہے۔ وہ اپنی عورت شازیہ کو ایک وحشی کی طرح دبوچ کر تسکین پاتا ہے۔ افسانہ

مرد کی کہانی بیان کرتے کرتے ایک نئی شازیہ کو سامنے لے آتا ہے۔ جی، جو ہے تو وہی مگر اندر سے اپنے مرد جیسی ہو جاتی ہے۔ مشتعل کرنے اور دبوچ لینے والی۔ اب دونوں کے بیچ کی بدکلامی اور تشدد ایسا ہی ہے جیسے کوئی بچے کے ساتھ باکسنگ کھیلتے ہوئے اُسے مکا مار دے تو وہ ہنسنے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ جنس کا یہ متشدد پہلو مرد کی ماں بہن کا ذکر بھی ننگی زبان پر یوں لے آتا ہے کہ اپنی اپنی چشم تصور میں وہ اُن کی انگیائیں بھی ڈھلکا لیتے ہیں۔ جنس پچھاڑنے پر آئے تو پچھاڑتے ہوئے کیسے، کسی بھی رشتے کو محترم نہیں رہنے دیتی، یہ اس کہانی کا موضوع ہو گیا ہے۔

اور ہاں ہمارے افسانہ نگار نے یہ بھی بتایا ہے کہ جنس محض صرف کرنے اور جب جی چاہے حظ اٹھا لینے والی شے نہیں ہے۔ یہ ایسا جذبہ ہے جسے پالنا پوسنا پڑتا ہے، جس کے ناز نخرے اٹھانے پڑتے ہیں، اس پر بھی خرچ اٹھتا ہے۔ اس بات کو افسانہ "یوسا" میں یوسف نامی ایک خسیس کردار کے ذریعے سمجھایا گیا ہے۔ یوسا دستیاب اور گرہستن جنس پر خرچ کرنے سے کتراتا ہے اور محض تماش بینی اور نظر بازی سے جنسی لذت کشید کرتا اور جذبوں کو انگیخت کرتا ہے۔ بھینسوں کے تھنوں سے دودھ کے قطرے نچوڑ لینے والا اور یہی دودھ اپنی گاہک عورتوں کے برتنوں میں انڈیلتے ہوئے ان کے گریبانوں میں جھانکنے والا یوسا اپنی زندگی میں اس لذت کی کشید کا انصرام کیسے کر سکتا ہے کہ وہ تو اپنی بیمار عورت پر خرچ کرنے کو تیار ہی نہیں ہے۔ اس کی عورت بچے جن جن کر اس حال کو پہنچی ہوئی ہے کہ اُس کا اندر لہو پھینکتا ہے۔ ایسے میں دوسری عورتوں سے جنسی خروش پانے والا اپنی بھینس بیچ کر بیوی کا

علاج کروا سکتا ہے، مگر وہ تو بس ناغے گنتے رہ گیا ہے۔ عورت اور جنس کے معاملے میں ایک خسیس شخص کا انجام اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا۔

میاں بیوی کے خوب صورت رشتے میں بندھے مرد اور عورت کے جنسی وفور میں رخنوں سے پیدا ہونے والے بگاڑ کو "نجمہ" نامی افسانے میں موضوع بنایا گیا ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ایک اچھے بھلے، محبت کی خوشبو سے مہکتا ہوئے گھر کو، کہ جس میں میاں بیوی اور بچے ایک متوازن اور باہمی تعلق کی سطح پر پرجوش زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں، مذہبی تنگ نظری تباہ کر دیتی ہے۔ یہ تباہی بے ریا محبت کی لپک کو منافقت کے حجاب سے بدل لینے سے آتی ہے۔ افسانہ جہاں ختم ہوتا ہے، وہاں بہ ظاہر سب کچھ ٹھیک ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مرد جسے پر اطمینان ظاہر کر رہا ہے خرابی وہی سے آغاز پا رہی ہے۔

سماجی خرابی اور اکھاڑ پچھاڑ کا، بعض اوقات معاشرے کے جن افراد کو سمجھا جا رہا ہوتا ہے، وہ نہیں ہوتے، بلکہ وہ معززین ہوتے ہیں جن کی طرف ہمارا دھیان بھی نہیں جاتا۔ افسانہ "رانی" میں ایسے افراد کو نشان زد کیا گیا ہے۔ میں نے اوپر کہا تھا کہ قمر سبزواری کو اپنے کردار بنانے کا ہنر آتا ہے، میرے اس دعوے کی غیر معمولی مثال اس افسانے کا مرکزی کردار ہو جانے والی رانی ہے۔

"پھر میرا دھیان واپس رانی کے جسم کی طرف چلا گیا۔ ایسے لگتا تھا جیسے ایک عورت کے بنتے ہوئے وجود کے اندر سے کسی نے کلائیوں سے پکڑ کر ایک مرد کو باہر نکالنے کی کوشش کی تھی اور فقط کہنیوں تک بازو باہر نکال کر چھوڑ

دیے تھے یا جیسے کسی عورت کے وجود کے تھیلے کو کھول کر کسی نے ایک مرد اندر گھسیڑ دیا تھا جو کہیں کہیں سے اب بھی نظر آ رہا تھا۔"

قمر سبز واری نے اپنے فن کو محض افسانوں کے کرداروں کو سلیقے سے تراشنے اور موضوع کو کہانی میں قرینے سے ڈھالنے تک محدود نہیں رکھا، اُنہوں نے گہری معنویت پیدا کرنے کے لیے، افسانے کے ماحول کے اندر سے علامتیں بھی تراشی ہیں۔ مثلاً افسانہ "دھاگے" ایک ٹیلرنگ شاپ پر دوستوں کی ملاقات سے شروع ہوتا اور وہیں تکمیل پاتا ہے۔ ٹیلرنگ شاپ پر کپڑے کے ٹکڑوں اور رنگ رنگ کے دھاگوں کو منظر نامے میں یوں بُن لیا گیا ہے کہ دھاگے علامت ہو کر بیانیے میں تہ داری پیدا کرنے کا سبب ہو گئے ہیں۔

"عمر حیات نے واصف کی طرف تائید طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، شرع میں کیا شرم جی۔۔۔ نکاح کیا تھا، خاوند نے اپنی بے راہ روی کی وجہ سے طلاق دے دی، دوسری شادی کر لو۔۔۔

کیوں جی اکبر صاحب، وہ اپنی قمیض کے دامن کے نیچے ہاتھ ڈال کر کھجلاتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔

جی جی شرع میں کیا شرم۔۔۔ میں نے پر زور تائید کی۔

عرفی سر جھکائے، جلتی سگریٹ کے انگارے کو انگلی سے کرید رہا تھا۔

لو کا ایک جھونکا دکان میں داخل ہوا جس کے زور سے کالا دھاگہ دیوار کے ساتھ جا لگا اور باقی سب دھاگوں نے اس کو دبوچ لیا۔"

اس افسانے کا عمر حیات ہماری معاشرت کا وہ رذیل کردار ہے جو شرافت کی من مانی تعبیر کر کے عورت کی تذلیل کا باعث ہو رہا ہے۔ افسانہ بتا رہا ہے کہ جھوٹی غیرت اور اوپر سے اوڑھی ہوئی اخلاقیات نے ہمارے سماج کو اندر سے کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔

یہاں تک آتے آتے دیکھا جا سکتا ہے کہ قمر سبز واری کے ہاں ان کو محبوب ہو جانے والا جنس کا موضوع قدرے پسپا ہوا ہے اور جنس کی جگہ دوسرے سماجی موضوعات نے لے لی ہے۔ اس تنوع کو اس مجموعے کے ایک اور افسانے "جلا تنک" میں دیکھا جا سکتا ہے جس میں ایک پلاٹ کا جھگڑا ہے۔ جی ایک قطعہ زمین کا جھگڑا، جس پر اس افسانے کے مرکزی کردار ملک کے دوست مولوی کو مسجد بنانا تھی اور اس کے دوسرے دوست ٹوانے کو دکان اور گھر۔ تینوں دوستوں کی دوستی کو اس پلاٹ کے حصول کی طمع عبرتناک انجام سے دوچار کر دیتی ہے۔ ملک کا کتا باؤلا ہو کر اس کے اپنے بیٹے کو کاٹ کھاتا ہے۔ کہانی کے آغاز اور انجام میں ایک ہی منظر کو رکھا گیا ہے۔ ایک ایسا منظر جس میں باپ بیٹے پر پستول تانے ہوئے ہے۔ یاد رہے بیٹے کو کاٹ کھانے والا، کتوں کی اس جوڑی میں سے ایک ہے ،جو اس کے دوست نے پلاٹ پر قبضے کے لیے ملک کو دیا تھا۔

افسانہ "ہوم لیس" بھی موضوع کے اسی تنوع کی مثال ہے۔ اس افسانے میں ماحول ہمارے ارد گرد کا نہیں، مگر انہی رویوں کی تظہیر ہو گیا ہے جو ہمارے ہاں سماجی وتیرہ ہو چکے ہیں۔ سردی میں ٹھٹھر کر مرتی ہوئی عورت وہاں کی سہی مگر اولڈ ایج ہوم میں پھینک دی جانے والی ماں، پیچھے رہ جانے والی ہماری ماؤں

جیسی ہی تو ہے جو ہمارے ہاں وہ توجہ بھی نہیں پا سکتیں جو توجہ ایک "ڈوگی" پالیتا ہے۔ انٹرنیٹ پر وائرل ہو کر کچھ ہی دیر میں نائین تھاؤزنڈ لائکس حاصل کرنے والا ایک کتا۔

اس مجموعے میں عورت اور مرد کے رشتے کی مختلف سطحیں جس سلیقے سے سامنے آتی ہیں، اردو ادب میں بہت زیادہ برتے ہوئے اس موضوع کو پرانا اور برتا ہوا ہونے کے باوجود نیا اور لائق توجہ بنا دیتی ہیں۔ مانتا ہوں کہ عورت اور جنس پر لکھنا فکشن لکھنے والوں کو بہت مرغوب رہا ہے تاہم یہ بہت کم ہوا ہے کہ اس باب میں وہ بغیر اُتھلے ہوئے کہانی مکمل کر لیں یا تلذذ کا شیرہ چاٹے بغیر موضوع سجھانے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔ عصمت اور منٹو کے بعد تو یہ موضوع اتنا صرف شدہ اور پامال ہو چکا ہے کہ جو بھی اس کوچے میں گھستا ہے، ہانپتا کانپتا باہر نکلتا ہے۔ قمر سبز واری کی کامیابی یہ ہے کہ انہیں، اپنے کرداروں کو اپنی مرضی سے ڈھال کر متن میں متحرک کرنے، اپنے محبوب موضوع کو کہانی میں تحلیل کرنے، کہانی کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اور واقعات کی ترتیب میں غیر محسوس سطح پر ادل بدل سے اس میں تجسس رکھنے اور صاف ستھری زبان کے استعمال سے فکشن کا خالص بیانیہ تشکیل دینے کا ہنر آتا ہے اور انہی فنی توفیقات کا فیضان ہے کہ وہ اس کوچے سے کامیاب نکلے ہیں۔

محمد حمید شاہد

انتساب

اُس کے نام جس کے بارے میں یہ چہ مگوئی ہو رہی تھی۔

میں ایک خلیفہ بنانے لگا ہوں!

ایسے کو کیوں بناتا ہے جو فساد کرے اور خون بہائے؟

جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

پیش لفظ

ڈائجسٹوں کی عشقیہ کہانیاں اور نصابی کتب میں تاریخ و ادب کے نام پر لکھے مذہبی قصے پڑھیے اور اپنے بچوں کو پڑھائیں تاکہ انھیں شاہ دولے کے چوہے بننے کے لئے سر پر آہنی ٹوپیاں نہ پہننی پڑیں بلکہ ایسی کتابیں اُن کے اذہان کو اندر سے ہی جکڑ لیں اور سروں کو چھوٹا کر کے چھوڑیں۔

مولویوں کی کتابیں پڑھیں تاکہ آپ غیر ضروری بالوں کے کاٹنے، استنجا کرنے، پائنچے اڑسنے، لمحوں میں طلاق کرانے، حلالہ کرنے اور خود سے اختلاف رکھنے والے ہر شخص کو کافر ثابت کرنے کے مختلف طریقے جان سکیں۔

ٹی وی اینکرز کو دیکھیں اور سنیں تاکہ آپ انسانی جسم و جذبات کے چھیتڑے بھنبھوڑنا اور پھر انھیں سجا کر بیچنا سیکھ سکیں۔

ہاں اگر آپ اپنے گرد و پیش میں بسنے والے انسان کو پڑھنا چاہتے ہیں اُس کے دکھ سکھ کو محسوس کرنا چاہتے ہیں، اس کی جبلت میں چھپی خواہش اور رینگتے خوف کو دیکھنا چاہتے ہیں، خود کو پڑھنا چاہتے ہیں تو ادب پڑھیں۔۔۔۔ میرے افسانے پڑھیں۔

پھانسے

یہ ایک عام سا گھر ہے جیسا شہر کے ایک مضافاتی علاقے کا عام سا گھر ہوتا ہے۔ چار کمروں کے اس گھر میں ایک شخص رات کے اس پچھلے پہر چھت پر تنہا بیٹھا چرس کی سگریٹ کے دھویں سے بننے والے مرغولوں میں کھویا کسی سوچ میں گم ہے اس کی ماں نیچے اپنے کمرے میں گم سم بیٹھی ہے اور اس کی بیوی اور بہن اپنے بچوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں بیٹھی خاندان کی ایک دو دیگر خواتین کے ساتھ باتوں اور تذکروں میں مصروف ہیں۔

یہ جو شخص چھت پر بیٹھا چرس پی رہا ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا اس کا نام رشید ہے اور اس کا باپ آج صبح اٹھاون برس کی عمر میں فوت ہو گیا۔
اُس شخص کی بیوی اپنی ساس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ ماں جی، رشید آپ کے پاس نہیں ہیں؟
وہ چند ثانیے اُس کے منہ کی طرف دیکھتی رہی اور پھر واپس اپنی سوچوں میں ڈوبتے ہوئے بولی، نہیں، کچھ دیر پہلے آیا تھا لیکن بس دروازے سے ہی کمرے میں ایک نظر ڈال کے واپس چلا گیا تھا۔

اچھا!! پتہ نہیں کہاں گئے، چلیں خیر میں ڈرائنگ روم میں دیکھتی ہوں شاید وہاں بیٹھے ہوں

رشید کی بیوی یہ کہہ کر کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے باہر نکلی تو اُسی اثنا میں رشید اُسے سیڑھیوں سے نیچے اترتا ہوا نظر آیا

ارے آپ چھت پر۔۔۔ کیا کر رہے تھے۔۔۔ اتنی رات گئے اس سردی میں

اُس کے لہجے کی لکنت بتا رہی تھی کہ اُسے اپنے سوال کے پوچھنے کے دوران ہی اُس کے غلط ہونے کا اندازہ ہو گیا تھا اسی لیئے اُس نے بے ساختگی میں منہ سے نکلتا ہوا سوال تین حصوں میں توڑ دیا۔

رشید نے اُس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے اُس کی طرف دیکھا اور سپاٹ لہجے میں بولا میں ذرا ڈرائنگ روم میں جا رہا ہوں، کچھ دیر کمر سیدھی کرنے

مجھے ڈسٹرب نہ کرنا۔ وہ اُس کو بیڈ روم میں لیٹنے کا کہنا چاہ رہی تھی، چائے کا ایک کپ بنا دینے کا پوچھنا چاہ رہی تھی لیکن گھر کے ماحول کی نزاکت اور اُس کا چہرہ دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی۔

رشید سر جھکائے دھیرے دھیرے چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اس نے دروازے کو بھیڑ کر ٹیوب لائٹ جلائے بغیر صوفے کا رخ کیا اور اس پر دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔

وہ اپنی ذہنی و جذباتی کیفیت کو سمجھنا چاہ رہا تھا، اپنی حیرت کو کوئی نام دینا چاہ رہا تھا لیکن اُسے تا حال کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس

کے بھیتر کیا چل رہا ہے۔

بس ایک مبہم سا لڑکھڑانے اور گرنے کے ڈر کا احساس، ایسے جیسے ایک رسی کو دو آدمی دونوں سروں سے پورا زور لگا کر کھینچ رہے ہوں اور ان میں سے ایک آدمی اچانک اپنا سرا چھوڑ دے۔

یا جیسے کسی خستہ دیوار کو دو لوگ اطراف میں کھڑے ہو کر دھکیل کر گرنے سے بچا رہے ہوں اور ان میں سے ایک اچانک پیچھے ہٹ جائے۔
اُس کا جسم صبح سے مسلسل بھاگ دوڑ میں مصروف رہنے کی وجہ سے تھکاوٹ سے چور ہو چکا تھا
کانوں میں ابھی تک عورتوں کے رونے اور صبح سے رات تک سنے گئے تعزیتی الفاظ کا ایک شور سا گونج رہا تھا
اور ذہن کے پردے پر دن بھر سامنے آنے، روتے دکھائی دینے، ملنے اور تعزیت کرنے والے مختلف چہروں کا ایک اژدھام سا تھا

یہ سب آوازیں اور تصویریں اُسے چند لمحے آنکھیں موند لینے اور نیند کی گود میں پناہ لینے پر مجبور کر رہی تھیں۔ لیکن سینے میں برپا ہلچل ذہن کے کسی گوشے میں رونما ہونے اور مسلسل اثر پذیر ہونے والی تبدیلی اُس کے لئے پھر بھی حیران کن تھی۔

صوفے پر لیٹتے ہی تھکاوٹ کی وجہ سے سوچ اور حیرت کا سلسلہ منقطع ہوا اور رشید کی آنکھ لگ گئی۔ صبح اپنے بیڈ سے بیدار ہونے پر اُسے یاد آیا کہ رات وہ ڈرائنگ روم کے صوفے پر لیٹا تھا اور عجیب سی کشمکش میں مبتلا تھا۔

دوسرے دن زیادہ کام کاج نہ ہونے کی وجہ سے رشید کا زیادہ وقت مہمانوں کے درمیان بیٹھے ہی گزرا۔ تعزیت اور بات چیت میں مصروفیت کے دوران اُس کا ذہن مصروف رہتا لیکن تنہائی میسر آتے ہی اُس کا دھیان جب بھی اپنے باطن کی طرف جاتا یا ذہن حال سے نکل کر ماضی اور مستقبل کا سوچتا تو اُس پر وہی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اُس نے محسوس کیا کہ جن باتوں اور گھر بار کی جن چیزوں کو وہ اپنی داخلی کیفیت سے لاتعلق سمجھتا ہے وہ بھی خاموشی سے اُس کے اندر کی کیفیت پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔

رسی کا دوسرا سرا چھوٹنے کی وجہ سے وہ لڑکھڑا کر جیسے کسی خواب سے باہر آ رہا تھا یا سینے میں تا حد احساس طویل دیوار کی دوسری طرف کا سہارا ہٹنے سے جیسے وہ دیوار سمیت منہ کے بل گرنے والا تھا۔

اُسے کالج کے زمانے سے ہی شراب کی لت تھی لیکن اُس کی حالت ایسی تھی کہ اگر وہ خود کسی کو نہ بتائے تو اُس کی بیوی کے علاوہ کسی کو پتہ نہ چلے، جب کبھی چند دن کے لئے شراب کا انتظام نہ ہو پاتا تو وہ کہیں اوٹ میں ہو کر چرس سے کام چلا لیتا

--

رشید کو اپنے باپ کے کمرے میں جانے کی عادت نہ تھی۔ وہ محفل میں بھی باپ کی موجودگی میں بیٹھنے سے کتراتا تھا لیکن تنہائی میں تو بالکل بھی ایسا موقع نہ آنے دیتا کہ وہ اکیلا باپ کے ساتھ بیٹھے اور کسی موضوع پر کوئی بات چھڑے۔

تیسرے دن سہ پہر کے وقت سوئم کی دعا سے فراغت پا کر جب مہمان چلے گئے تو وہ باپ کی فوتگی کے مخصوص وقت کو چھوڑ کر نجانے کتنے عرصے بعد اپنے باپ کے کمرے میں داخل ہوا ،اُس کی بیوی اُس کی اکلوتی بہن اور اُس کی ایک پھوپھو بھی اُس کی ماں کے پاس بیٹھی اُس کے مرحوم باپ سے متعلق باتوں اور پرانی یادوں کو کریدنے میں مصروف تھیں۔

اُس نے در و دیوار کو نظر بھر کے دیکھا اور پھر باپ کے بستر کو دیکھتے ہوئے کہیں کھو گیا۔
اُس کی بڑی پھوپھو نے اُس کے چہرے کی طرف اور پھر اُس کی ماں کی طرف دیکھا لیکن کچھ نہ بولیں۔

وہ اپنے بھائی کی کوئی پرانی بات یاد کر رہی تھیں۔ چند ثانیے کے توقف کے بعد وہ دوبارہ بولیں۔ایک دفعہ کیا ہوا، یہ بہت پرانی بات ہے، ابھی، ہم میں سے کسی کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی، اُس کی پھوپھو نے اُس کی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بات شروع کی۔

ابا جی آم کی پیٹی لائے ، بہت بڑھیا آم لاتے تھے ابا، اور تمھیں تو پتہ ہے بھائی ظریف کو آم کتنے پسند تھے۔ اچھا تو ابا جی نے کہا بھئی ظریف جب تک تمھاری ماں چائے بناتی تم ان سب آموں کو دھو کر ڈول میں ڈالو اور احتیاط سے کنویں میں لٹکا دو، میں چائے پی کر نماز پڑھ لوں پھر کچھ دیر میں جب آم خوب ٹھنڈے ہو جائیں گے تو کھاتے ہیں۔

اماں جی اٹھ کر چائے بنانے چلی گئیں، میں پاس بیٹھی سکول کا سبق پڑھ رہی تھی لیکن جب بھائی، جی ابا جی کہہ کر خوشی سے اٹھا تو مجھے بہت حیرت ہوئی کہ ہر کام میرے سر تھوپنے والا بھائی ظریف آج اتنی برخورداری کیوں دکھا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں پانی پینے کا بہانہ کر کے باہر نکلی اور برآمدے میں چھپ کر جو دیکھا تو بھائی نے آم دھو کر کنویں کے ڈول میں ڈالتے ڈالتے ایک موٹا سا آم اُس لوٹے میں ڈال دیا، جو پرانا ہونے کی وجہ سے کنویں کے پاس ایک طرف رکھ دیا گیا تھا۔

میں خاموشی سے اندر آگئی، اور وہ کسی سے ملنے باہر گلی میں چلا گیا۔ جب ابا جی چائے پی کر وضو کرنے اٹھے تو مجھے پانی کا لوٹا لانے کا کہا، میں نے ہمت کر کے پرانے لوٹے میں پانی ڈالا اور ابا جی کے وضو کی جگہ رکھ دیا۔ ابھی ایک منٹ بھی نہ گزرا تھا کہ ابا جی کی آواز صحن میں گونجی، ظریف، اوئے کھوتے دے پتر ، یہ آم کہاں دھوتا اور کہاں ڈالتا رہا ہے۔ ذرا ادھر میرے پاس تو آ، ظریف بھائی جو اُسی وقت کمرے میں آ کر بیٹھا تھا خونخوار نظروں سے مجھے دیکھتا ہوا میرے پاس سے اٹھا اور باہر ابا جی کی ڈانٹ کھانے چلا گیا۔

اُس دن اباجی نے میری وجہ سے سزا کے طور پر بیچارے کو ایک آم بھی نہ کھانے دیا۔

رشید کے ذہن میں یہ بات سن کر جیسے ہی ایک کھلنڈرے سے نوجوان کی تصویر ابھری

اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے سینے میں جیسے کوئی شے ٹوٹ کر گری ہو، اس بار احساس قدرے واضع تھا، جیسے اُس کے سینے میں موجود فلک بوس دیوار میں شگاف بن گیا تھا اور اُس کے پیچھے کا منظر اُس کے توقع کے بالکل برعکس تھا۔

رشید کا اپنے باپ کے ساتھ رشتہ ہمیشہ تناؤ کا شکار رہا، کبھی اگر اُس کے ذہن میں اپنے رشتے کی ایک تصویر سی بنتی تو دھیمی سی آنچ پر رکھی کھولتے ہوئے تیل کی کڑاہی جیسی تصویر بنتی ۔۔ جس میں اُن کا رشتہ کھولتے تیل کی طرح تھا، رشید کے شب وروز اُس کھولتے تیل میں پک پک کر نکلتے رہے اور رشتے کا وہ تیل دن بدن کڑوا اور میلا ہوتا گیا۔ ظریف سخت مزاج تھا اور رشید ذکی الحس، باپ اصول پسند تھا اور رشید متلون مزاج ولا ابالی، باپ اُس کی ماں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتا کبھی کبھی ہاتھ بھی اٹھا دیتا اور رشید عملی طور پر باپ کو ایسا کرنے سے نہ روک سکنے کے سبب اپنے دل میں ایک دیوار اور کھڑی کر لیتا۔

رشید کی بیوی سب کے لئے چائے بنانے اٹھی تو وہ خاموشی سے اپنی ماں کے کمرے سے اٹھا اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا، دو دن کے اچانک صدمے کے بعد اب حواس کے واپس معمول پر آنے کی وجہ سے اور دماغ کے اس حقیقت کو تسلیم کر لینے

کی وجہ سے کہ اُس کا باپ فوت ہو چکا ہے اُس کے ذہن نے ماضی کی یادوں کو تسلسل سے چلانا شروع کر دیا تھا۔

وہ آنکھیں موندے لیٹا ہوا اپنے ماضی کی یادوں میں محو ہو گیا۔

اُس کے نیم غنودگی میں ہونے کی وجہ سے یادوں کے منظر بالکل ایک خواب کی طرح حقیقی رنگ اختیار کر رہے تھے

اُس کے کانوں میں اس کی اپنی آواز گونجی

ابا، ابا مجھے بھی ڈور پکڑاؤ نا، اُس نے ضد کرتے ہوئے کہا تھا

اوئے، پگلے، ہوا دیکھ کتنی تیز ہے اور پتنگ بڑی ہے تیری انگلی کاٹ کے لے جائے گی۔۔۔۔۔

ابا کی آواز جیسے حقیقت میں اس کے کانوں میں گونجی۔۔

اُس نے ڈور کی چرخی پھینک دی تھی اور ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا تھا

ابا نے اُس کی اس حرکت پر اُسے سختی سے ڈانٹ دیا تھا

جذبات کی رو بدلنے سے اچانک منظر تبدیل ہوا اب وہ سائیکل چلانا سیکھ رہا تھا اور اُس کا باپ ایک ہاتھ سائیکل کے ہینڈل پر اور ایک اُسے کے شانے پر رکھے اُس کو سمجھا رہا تھا

سامنے دیکھ، اوئے تجھے کہہ رہا ہوں سامنے دیکھ ہینڈل پر سے نظریں ہٹا

اُس نے پھر ہینڈل کو گھورا۔۔۔

کھوتے دے پتر ڈر نہیں، ڈرتا کیوں ہے

یہ آواز اُس کے کانوں کے بجائے اُس کے سینے میں گونجی۔۔۔
اُس نے سائیکل کا ہینڈل چھوڑ دیا تھا اور منہ کے بل زمین پر گرا تھا

اسی دوران اُس کے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا۔۔۔اُس وقت کے غم و غصے کے جذبات اور آج ان واقعات کو یاد کر کے محسوس ہونے والے رد عمل میں کتنا فرق ہے۔

وہ یادوں کو جھٹک کر نئے خیال کے ادھیڑ بن میں پڑ گیا۔

اُس وقت اتنا شدید غم کیوں محسوس ہوتا تھا، اُس کا جی کیوں چاہتا تھا کہ وہ ڈانٹ کھانے کے بعد ابا سے کبھی پیسے نہ مانگے، کبھی گھر سے کھانا نہ کھائے اور کبھی ابا سے بات بھی نہ کرے۔

اُسے پھر سے یاد آیا کہ ان دنوں اُس کا شدید جی چاہتا تھا کہ اُس کی بازو یا ٹانگ ٹوٹ جائے یا اُسے کوئی بہت بڑی چوٹ آجائے یا ٹی وی میں ایک بار ایک ڈرامہ دیکھ کر اُس کا جی چاہا تھا کہ ڈرامے کے ہیرو کی طرح اُسے بھی کینسر کی بیماری لگ جائے اور اُس کے ابا اُس کے پاس آنا چاہیں، اُسے دوا دینا چاہیں یا اُس سے پوچھیں کہ تمھیں درد تو نہیں ہو رہا اور وہ کچھ نہ بولے کچھ نہ بتائے اُن کے ہاتھ سے لے کر کچھ نہ کھائے بلکہ اُن کے پیسوں کی دوا بھی نہ کھائے۔

وہ خیالوں کی دنیا میں واپس جاتا تو اُس کا سینہ جذبات سے لبریز ہو جاتا لیکن جیسے ہی خیال و تفکر کی دنیا میں واپس قدم رکھتا اُسے اپنے خام جذبات پر ہنسی آتی۔

خیال نے پھر یاد کا روپ دھارا، منظر بدلا ایک بار جب گلی میں کرکٹ کھیلتے ہوئے اُس کی کمر پر گیند لگ گئی تھی تو اماں نے اُسے دروازے پر ہی ملنا شروع کر دیا تھا

لیکن ابا نے دونوں کو ڈانٹ کر کہا تھا، او نیک بخت کھیلنے دے اسے گرنے دے لگنے دے۔اس کی ماں نے جب حیرت سے ابا کی طرف دیکھا تھا تو وہ ہنس پڑے تھے وہ عجیب سے انداز میں ہنستے ہوئے، تم دونوں تو نرے الو کے پٹھے ہو، کہہ کر کمرے میں چلے گئے تھے

اچانک اُس کے ذہن نے اپنے خیال کی تصویروں پر سے توجہ ہٹا کر اُن کے گرد لپٹے ہوئے احساسات کو پکڑ لیا۔

اُس کے ذہن کے پردے پر چلتے ماضی کے فلم میں حال کا ایک منظر جیسے خود بخود شامل ہو گیا جب اُس کا پانچ برس کا بیٹا انجکشن لگنے پر رویا تو اُس کی بیوی کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے تھے بیوقوفی نہیں کرو اس کے سامنے کیوں ٹسوے بہاتی ہو، انجکشن لگ رہا ہے کہ آپریشن ہو رہا ہے ؟اُس نے بیوی کو ڈانٹ دیا تھا۔
آج نہ جانے کیسے ان کیفیات کے محرکات پر غور کرنے کا ایک سرا اُس کے ہاتھ میں آ گیا تھا وہ حیرت سے سوچنے لگا۔۔
یا شاید میں نے ایسی کوشش ہی آج پہلی بار کی ہے ایسا پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔۔

پہلے تو جذبات کی شدت کی وجہ سے کبھی وہ ان یادوں کو اس طرح تفصیل سے دہرا بھی نہ پایا تھا، بس ایک ہلکی سی جھلک اُس کے ذہن کے پردے پر نمودار ہوتی یا ایک مبہم سی ٹیس اُس کے سینے کے کسی نامعلوم مقام پر اٹھتی اور وہ اپنی سوچ کو جھٹک دیتا۔

لیکن اب وہ تیس برس کی عمر کو پہنچ چکا تھا اُس کی بیوی اُس کے دوسرے بچے کو اپنی کوکھ میں پال رہی تھی اور اُس کا باپ قبر میں اتر چکا تھا، اُس کی سوچ عرصہ ہوا جذبات کی تنگ نائے سے نکل کر تجربے اور تحمل کے میدانوں تک پہنچ چکی تھی۔۔

اُسے احساس ہوا کہ اُس کا حال تو شعور کی بلوغت کے زیراثر گزر رہا تھا لیکن ذہن کی اس تبدیلی کی روشنی میں اُس نے اپنی سابقہ زندگی کے جذبات کو کبھی نہ دیکھا تھا یا ایسا وہ آج پہلی بار کر رہا تھا۔

کیوں آخر کیوں میں نے کبھی ان یادوں ان باتوں کو ایسے نہیں دیکھا کبھی ان میں اترنے کی کوشش نہیں کی بلکہ یہی میرے اندر اتر کر مجھے کاٹتی رہیں۔

ذہن کے نیند اور بیداری کی سرحد پر ہونے کی وجہ سے اُس کے سوچنے کا عمل خواب جیسا تھا جہاں مناظر اُس کی مرضی سے نہیں بلکہ ایک غیر مانوس بہاؤ کے تحت چل رہے تھے۔

اُس کا تصور ذہن کے پردے پر گردش کرنے والے مناظر کے اندر اتر گیا زمان و مکان کے عین اُس لمحے میں جب وہ باتیں وہ واقعات ہو رہے تھے۔

اب وہ سوچ نہیں رہا تھا بلکہ وہ پرانے واقعات اُس پر دوبارہ سے بیت رہے تھے۔
ایک بار پھر اُسے ابا چھت پر پتنگ اُڑاتے ہوئے دکھائی دیئے۔۔۔

ابا۔۔۔ابا مجھے بھی ڈور پکڑاؤنا، اُس نے ضد کرتے ہوئے کہا
اوئے، پگلے، ہوا دیکھ کتنی تیز ہے اور پتنگ بڑی ہے تیری انگلی کاٹ کے لے جائے گا
ابا نے پتنگ پر سے نظریں ہٹائے بغیر اُسے جواب دیا۔۔
یہاں، بس یہاں ایک متحرک تصویر تھی جو لکڑی کے ایک پھانے کی طرح اُس لمحے میں اتری ہوئی تھی اور اُس کو درمیاں سے چیر رہی تھی اُس نے آج سے پہلے کبھی یہ تصویر نہ دیکھی تھی۔
ابا کی بات سن کر اُس کے ذہن میں اماں اور ابا کے لڑنے کی تصویر ابھر آئی تھی
اور اس نے یہ دیکھے بغیر کے کیا واقعی ہوا تیز ہے کیا واقعی پتنگ بہت بڑی ہے
یہ سوچا تھا کہ ابا ہے ہی ظالم۔ وہ ماں کو بھی ڈانٹتا ہے اور مجھ سے بھی نفرت کرتا ہے
ابا بھلا مجھے پتنگ کیوں دینے لگا؟ اُس نے ڈور کی چرخی پھینک دی اور ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ابا نے اُس کی اس حرکت پر اُسے سختی سے ڈانٹ دیا

تصویروں اور آوازوں کی کڑیاں آپس میں ملنے لگیں
ہر تصویر، ہر آواز میں وقت کے ہر لمحے میں

پھانے اترے ہوئے تھے

۔ابا ہے ہی ظالم۔۔۔ابا ماں کو بھی ڈانٹتا ہے۔۔۔۔ابا مجھ سے بھی نفرت کرتا ہے۔۔۔۔

یادوں کی زنجیر طویل ہو کر ماضی سے حال تک پہنچنے لگی اور ساتھ ساتھ وہ پھانے بھی۔

اُسے ہر وہ ٹی وی ڈرامہ، ہر وہ کتاب ہر وہ بات یاد آنے لگی جو اُس نے فقط اس لیئے مسترد کر دی تھی کہ وہ اُس کے باپ کو پسند تھی۔

اُسے کالج کا وہ دن یاد آیا جب اُس نے پہلی بار دوستوں کے ساتھ شراب صرف اس لئے پی تھی کہ اُسے اپنے سینے میں کوئی شے اترتی ہوئی محسوس ہوتی رہتی تھی۔آج اُسے اپنی پسلیوں کے آر پار وہ پھانا نظر بھی آنے لگا۔

لوہے، لکڑی گوشت، ہڈیوں اور نہ جانے کس کس شے کے بنے ہوئے بھدے اور میلے سے رنگوں کے پھانوں کی ایک قوس قزاح تھی جو اُس کے ماضی کی اولین یادوں سے لے کر اُس کے حال تک آ رہی تھی اور عین سینے کے درمیان ایک فلک بوس دیوار بناتے ہوئے، جس کا کوئی سرا نہ تھا،اُسے درمیان سے چیرتی ہوئی دو حصوں میں تقسیم کر رہی تھی۔

اُس نے اس کیفیت سے فرار کی شدید خواہش محسوس کی اور آنکھیں کھول کر خالی نظروں سے چھت کو گھورنے لگا

سوچ کی اس دوسری لہر کے وجود کو مانتے ہی اور اس کی طرف توجہ کرتے ہی اُس کے جذبات کا رخ یکسر بدل گیا،اُس کے سینے میں کھڑی عظیم دیوار میں دیوار میں جا بجا شگاف پڑنے لگے اور اُسے اُس کے پیچھے کا منظر دکھائی دینے لگا

دیوار کی دوسری طرف اُس کا باپ تھا۔ باپ کے وجود کا احساس کرتے ہی وہ پھر سے جھجک گیا

انائیت کے احساس نے اُس کو کشمکش و پیچ میں ڈال دیا۔

اس دیوار کو مسمار کرنا چاہا رہا تھا اس کی دوسری طرف جانا چاہ رہا تھا۔ لیکن یہ معلوم کرنے کا کوئی طریقہ اُس کے ذہن میں نہیں آرہا تھا کہ اُس کا باپ بھی ایسا چاہ رہا ہے یا نہیں۔ کیا وہ اُس کو پرے دھکیل کر اُس کی انا کو مجروح ہوتا دیکھ کے ہنسے گا یا اُس کو سینے سے لگالے گا۔

احساس کی چوٹوں سے چند ہی لمحوں میں اُس کی حالت ماہی بے آب کی طرح ہو گئی

وہ اپنے باپ کی شکل کو اس کے وجود کو یاد کرنے لگا۔

ابا کے ہاتھ،اُن پر پڑی جھریاں، گردن پر موجود دو تل، باریک کٹی ہوئی مونچھیں حتیٰ کہ پاؤں کے انگوٹھوں کے ناخن تک اُس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگے لیکن بس نہیں بن رہی تھی تو ایک تصویر واضع نہیں بن رہی تھی اور وہ تھا اُس کے ابا کا چہرہ، چہرے کے خدوخال۔

نہ جانے ذہن کے کس گوشے سے رشید کی پہلی تنخواہ والا دن اُس کی آنکھوں کے سامنے آگیا

جب اُس نے تنخواہ لاکر ابا کے پاس میز پر رکھی تھی تو اچانک اُن کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی

اوئے نہ او پتر، مجھے بھلا کیا ضرورت، اگر کچھ دینا ہی ہے تو اپنی ماں کو دیا کر

اور پھر انھوں نے بلند آواز میں کچن میں مصروف اُس کی ماں کو بلایا تھا

لے بھئی، آج سے تیرا بیٹا اس گھر کا بڑا ہو گیا

لے پھر اسی خوشی میں آج کچھ میٹھا ہی پکا لے۔

وہ بے چینی سے اٹھا اور باپ کے کمرے کی طرف چل پڑا جہاں اس وقت اُس کی ماں اور پھوپھو، گھر کے دیگر افراد کے ساتھ بیٹھے اُس کے باپ کی باتیں کر رہے تھے۔

وہ اُسی کمرے میں بیٹھنا چاہ رہا تھا جہاں اُس کے باپ نے زندگی کے آخری ایام گزارے تھے

اب اُس کا دل اپنے باپ کے بارے میں ہر بات سننے کو چاہ رہا تھا۔

وہ اپنے کمرے سے نکل کر اپنے باپ کے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔

ابھی اس نے بند دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ بلند کیا ہی تھا کہ اُسے اپنی پھوپھو کی آواز سنائی دی۔

نہیں ہمیں تم سے کوئی گلہ نہیں ہے تم ہمارے خاندان کی عزت ہو ہماری سب سے اچھی بہو ثابت ہوی ہو

بس ظریف کے صدمے سے دل دکھا تو آج یہ بات کہہ دی

میں تمھیں بتاؤں کہ وہ کبھی ہم بہنوں سے تمھاری یا اپنے گھر کی کوئی بات نہیں کرتا تھا

بس ایک بار پتہ نہیں ہم کیا بات کر رہے تھے تو کہنے لگا

آپا میں سمجھتا ہوں کہ میرا رویہ اپنی بیوی کے ساتھ قدرے سخت رہا ہے

لیکن آپا جب ہم دونوں میں ذہنی ہم آہنگی نہ بنی تو رشید نے بیچ میں آکر میرے جبر کا رخ موڑ دیا، کاش کوئی ایسا بھی ہوتا جو میرے اور میرے بیٹے کے درمیان آکر بھی کچھ ایسا کر دیتا۔

اُس کو سمجھا دیتا یا مجھے ہی بدل دیتا

رشید کمرے میں داخل ہوا تو اُس کی پھوپھو خاموش ہو گئیں۔

اُس کے سینے میں باپ کے لمس کی اُس کے سینے سے لگنے کی اُس کو چھونے کی خواہش پیدا ہوئی اور پورے جسم میں پھیل گئی۔۔وہ خاموشی سے باپ کے بیڈ پر

بیٹھا اور پاس پڑے میز پر رکھے اُس کے چشمے، سگریٹ کی ڈبیا اور بازو کی گھڑی کو ایک ایک کر کے چھونے لگا۔

ہوم لیس

وہ ہونٹوں سے سیٹی بجاتا بجاتا اپنے فلیٹ سے نکلا۔

دورازے کو تالا لگاتے ہوئے اُس نے سوچا

آج آخری دن ہے

آج دن کو کسی وقت بھی اُسکی بیوی واپس آ رہی تھی اور پھر

وہ ناشتہ کرنے باہر نہیں جایا کرے گا

ویسے تو وہ پچھلے کچھ دنوں سے ریسٹورانٹ پر ناشتہ کر کے وہیں سے آفس جاتا تھا لیکن

آج چھٹی کا دن تھا، ناشتہ کر کے اُسے واپس آنا تھا

اُس نے سخت سردی سے بچنے کے لئے ٹراؤزرز اور ٹی شرٹ کے اوپر ہی چیسٹر پہن لیا تھا

دروازے کو لاک لگا کر اُس نے چابی ہوا میں اچھالی

بلندی کی طرف جاتی ہوئی شے زمین کی طرف واپس آنے سے پہلے

ایک لمحے کو ہوا میں رکتی ہے، اُسی معلق لمحے میں

کمزور بلب کی ٹمٹماتی روشنی میں سرنگ کی طرح دکھنے والے کوریڈور میں پڑی

ایک پوٹلی نما شے میں حرکت ہوئی

چابی نیچے گر گئی

اُس نے سر سراتی گٹھڑی سے نظریں ہٹائے بغیر چابی فرش سے اٹھائی اور اُس کے پاس چلا گیا
یہ ایک سن رسیدہ عورت تھی
سردی سے ٹھٹھری ، بھوک سے دہری ہوئی اور پکڑے جانے کے ڈر سے سہمی ہوئی۔
اُس کے پاس ایک شاپنگ بیگ میں ڈرائی فروٹ کے چھوٹے چھوٹے چند پیکٹ تھے لیکن اُس کے پوپلے منہ اور پچکے ہوئے جبڑے کی ساخت سے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ ڈرائی فروٹ تو کیا شاید سینڈوچ بھی چبانے سے قاصر ہے۔
اس کے بال کھچڑی تھے لیکن ان کی وضع قطع اور انداز بتا رہا تھا کہ ماضی قریب میں وہ گھنی اور خوبصورت زلفوں کی مالک رہی ہو گی

شاید یہ عورت ہوم لیس تھی اور ٹریفک سگنل پر چھوٹی موٹی اشیاء بیچ کر گزارا کرتی تھی
ایسے لوگوں کو کبھی شیلٹر میں جگہ ملتی ہے کبھی نہیں
کبھی کچھ بک جاتا ہے کبھی نہیں بھی بکتا
لیکن اس سردی میں پوری رات باہر بھوکے پیٹ۔۔۔۔
اُس سے بات کا آغاز کرنے سے بھی پہلے ہی اُس کے دل نے سرگوشی کی ارے نہیں آج کسی بھی وقت بیوی واپس آ رہی ہے وہ کہاں مانے گی
پچھلی بار جب ایک نو عمر بچے کو سیڑھیوں کے پاس زخمی حالت میں پا کر وہ کچھ دیر کے لئے گھر لے آیا تھا

تو بیوی نے طوفان کھڑا کر دیا تھا

کیسے چیخ چیخ کر گھر سر پر اٹھا لیا تھا کوئی مجھے بتائے گا کہ یہ ہسپتال ہے، یتیم خانہ یا ویلفیئر سینٹر؟

شادی سے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ اپنے گھر نہیں ایک سب وے میں ایک میٹرو سٹیشن پر لے کے جا رہا ہوں؟

وہ تو خیر جس کی وہ مدد کرنا چاہتا تھا وہ ایک بے کس کم عمر لڑکا تھا اگر کوئی عورت ہوتی تو قانون کے مطابق

بیوی اُس کے خلاف یہ کیس بھی کروا سکتی تھی کہ وہ اُس کا آدھا حق کسی اور عورت کو دے رہا ہے۔

کچھ گھنٹوں کے لئے تو فلیٹ میں لے جا سکتا ہوں،

اس کے سینے میں لاغر سی سہمی ہوئی احتجاجی صدا بلند ہوئی۔

ناشتہ کروا کے کافی پلا کے کہیں بھیج دوں گا وہ زیر لب بڑبڑایا جیسے اس کمزور آواز کی تائید کرنا چاہ رہا ہو

لیکن اگر بیوی جلدی آ گئی تو

یا کوئی دوست ادھر آ نکلا تو کیا ہو گا، آج ویسے بھی چھٹی کا دن ہے

اور اگر میں ناشتہ لینے گیا اور یہ عورت میرے فلیٹ میں مر گئی تو۔۔۔

یا جانے سے ہی انکار کر دیا تو

ایسے لوگوں کو جب نرم بستر، گرم کمرا اور کھانا ملتا ہے تو۔ کہیں جانے کا نام ہی نہیں لیتے۔۔۔ نہیں نہیں

اُس کی انکھوں کے سامنے اپنے دونوں قریبی دوستوں کے طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے چہرے گھومنے لگے۔۔۔۔

کیوں رے احمق کیوں ایسی حرکتیں کرنے سے باز نہیں آتا؟

بھابھی گھر سے جاتی ہیں تو پیچھے کوئی نہ کوئی گل کھلایا ہوتا ہے تو نے۔۔۔

بیوی تو بیوی، دوست یار بھی بس ایسے ہی ہیں اُس نے جھنجھلا کر سوچا

کسی کو اس طرح کی باتوں میں الجھنا بل شٹ سے زیادہ نہیں لگتا،

اور کوئی اس سب کو نان سینس کہتا ہے۔۔۔

نہ جانے کیوں اسے اپنی ماں یاد آگئی اگر وہ زندہ ہوتی تو بالکل بھی اعتراض نہ کرتی لیکن ماں خود بھی تو اسی طرح بیمار اور کمزور تھی اور وہ ان دنوں بیوی کی طبیعت اکثر خراب رہنے کی وجہ سے ماں کو اپنے ساتھ نہ رکھ سکا تھا۔۔۔۔

وہ قریب جا کر نیچے جھکا تو عورت کے پھٹے ہوئے بوسیدہ کمبل سے جھانکتے چہرے پر دھنسی آنکھوں کو بالکل سر پر لگے بلب کی روشنی میں دیکھ کر سکتے میں آگیا

اس عورت کی تیز بلوری آنکھوں میں اس کے ماضی کے وقار اور متانت کا عکس ابھی بھی جھلک رہا تھا شاید اسی لئے اس نے کسی کا دروازہ نہ کھٹکھٹایا تھا۔

اُسے دیکھتے ہی عورت کی آنکھیں پہلے خوف سے سکڑیں اور پھر ان میں امید کا ایک دیا سا روشن ہو گیا۔

ویسی ہی موہوم سی چمک جیسی کبھی کبھی اپنے پرانے گھر کے کونے والے کمرے میں وہ اپنی ماں کو

چائے کا گرم کپ پکڑانے جاتا تھا تو اس کی آنکھوں میں آجایا کرتی تھی۔

وہ واپس سیدھا ہوا ایک ثانیے کو کچھ سوچا اور پھر

اپنی سوچ کو نا قابل عمل جان کر جیب سے ایک چھوٹا نوٹ نکال کر اُس عورت کے پاس بیٹھ گیا

اُس نے اُس کا ہاتھ پکڑا یخ بستہ انگلیاں برف کی سلاخوں کی طرح اُس نے سینے میں اتر گئیں۔

ایک لمحے کو اس نے اس عورت کو گرم کمرے میں نرم گداز کمبل میں دبکے ہوئے دیکھا جس کے سامنے وہ تازہ کھانا اور گرما گرم کافی کا مگ رکھ رہا تھا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اپنا سر جھٹک دیا۔

اپنی مٹھی سے نوٹ اُس نے اُس بوڑھی عورت کی سرد ہتھیلی پر منتقل کیا اور اُس کے ہاتھ کو بند کر کے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا

اُس عورت کی آنکھوں میں کچھ دیر پہلے جلنے والا امید کا دیا اب ایک سگریٹ کے انگارے کی مانند رہ گیا تھا

راکھ میں تبدیل ہوتی ہوئی آخری چنگاری کی طرح

بالکل ایسی ہی ایک لالی اس دن اس کی ماں کی آنکھوں میں تھی جس دن وہ اسے اولڈ ایج ہوم میں چھوڑ کر آیا تھا۔

لیکن اس بات کا احساس اُسے آج اس عورت کی آنکھیں دیکھ کر ہوا تھا ورنہ آج تک وہ یہ سمجھتا رہا تھا کہ جس کمرے میں اس نے ماں کو چھوڑا تھا اس کی کھڑکی کھلی تھی اور شام کے غروب ہوتے سورج کی لالی ماں جی کی بلوری پتلیوں سے منعکس ہو رہی تھی۔

وہ اُس عورت کا ہاتھ دھیرے سے واپس کمبل میں رکھ کر یکدم اٹھا اور چند قدم واپس پلٹ کر ایک نظر اپنے تھری بیڈروم فلیٹ کے دروازے پر ڈالتا ہوا بائیں ہاتھ سیڑھیوں کی طرف جانے والے رستے پر مڑ گیا۔

یہ ایک تجارتی ورہائشی عمارت تھی نیچے شاپنگ مال اوپر کچھ سٹورز اور کچھ بیچلرز کے سٹوڈیو فلیٹس اور اس کے اوپر فیملیز کے لئے باقائدہ رہائشی فلیٹس۔

مارکٹ کھلنے میں ابھی تین چار گھنٹے پڑے تھے رات کو دیر تک بکنے والی اشیاء کی پیکنگ کی پیٹیاں، تھرموپور کے ٹکڑے، بچا کچا کھانا، پھلوں کے چھلکے سگریٹ کے چھوٹے بڑے ٹکڑے فرش پر گری چائے کے داغ، مڑے تڑے کاغذ کے پرزے، اخبارات کے اوراق، اور جا بجا تھوک و بلغم کے نشانات اس وقت متعفن کوڑے میں تبدیل ہو چکے تھے۔

مال کی سب دکانیں بند تھی اور چاروں اطراف ہو کا عالم تھا۔ چاروں طرف دور تک جاتے آرکیڈ کی چھت سے لٹکے جامد پنکھے اور بجلی کے تاروں کے سروں پر جھولتے بڑے بڑے بے نور بلب نیم اندھیرے میں سرد مردہ خانے میں لٹکے بے جان جسموں کی طرح لگ رہے تھے۔

اس نے ٹین کے ایک خالی ڈبے کو ٹھوکر مارتے ہوئے سوچا۔ رات کی چکا چوند اور گہما گہمی کا حاصل یہ کوڑے کے ڈھیر اور یہ تنہائی وسناٹا۔۔۔ ٹھوکر کی آواز سناٹے میں رینگتی ہوئ دور تک چلی گی۔ جس کی گونج ختم ہونے پر مارکیٹ کے چوکیدار نے دور کسی گوشے سے کھانس کر گلہ صاف کرتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

وہ بوجھل قدموں سے خارجی راستے کی طرف جارہا تھا جہاں سے چند عمارتیں آگے کچھ ریسٹورنٹ تھے۔

مارکیٹ کے فولڈنگ گیٹ کی دونوں اطراف مٹی اور کوڑے کی وجہ سے اب نہ بند ہوتی تھی اور نہ مزید کھلتی تھی۔۔۔۔

پتہ نہیں کس طرح کتے کے ایک پلے کا پاؤں فولڈنگ گیٹ کے آہنی چوکٹے کے بیچ میں آکر پھنسا ہوا تھا اور وہ خفیف سی آواز میں ٹاؤں ٹاؤں کیے جارہا تھا۔

اُس نے کتے کے پلے کو دیکھا تو ترحم کا ایک جذبہ اُس کے دل میں اتر آیا

پلے کے پاس جانے سے پہلے ہی اُس کے دل میں خیال گزرا

اگر یہ زخمی ہوا تو گھر لے جاؤں گا، شاید لاوارث ہی ہے ورنہ ابھی تک کوئی لے گیا ہوتا۔۔۔بیوی بھی خوش ہوگی اور بچے کی تو موجیں ہو جائے گی۔

کتے کے پلے کا پاؤں شاید دکھ رہا تھا۔

وہ ایک عام سی نسل کا لیکن خوبصورت کتا تھا نہ جانے کیسے یہاں پھنس گیا اور بیچارہ کب سے ٹاؤں ٹاؤں کر رہا تھا۔

وہ اُس کے پاس بیٹھ گیا اور احتیاط سے اُس کا پنجہ لوہے کے خانے سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا

سامنے سڑک سنسان تھی اکا دکا گاڑی یا اخبار فروش گزر رہے تھے یا پھر دور کے سکولوں کی بسیں آکر رکتیں اور پھر آگے بڑھ جاتیں۔

اس نے پلے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور اس کے پنجے کو اپنے ہاتھ میں لے کر گرم کرنے لگا تاکہ وہ ڈھیلا پڑے اور جکڑ سے نکلے اسی اثناء میں ایک سکول بس اُس کے بالکل پاس آ کر رکی اس نے اوپر دیکھا اور پھر اپنے کام میں لگ گیا۔

اچانک دھیان جانے پر اُس نے پھر منہ اٹھا کر اوپر دیکھا بس میں بیٹھی ایک ٹیچر اپنے موبائل سے اُس کی مووی بنا رہی تھی۔

وہ قدرے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، ایک گھٹنے اور پنڈلی کو زمین پر بچھا لیا اور دوسرے پاؤں کو سامنے کی طرف رکھ لیا ہاتھ میں پکڑا مفلر وہ پہلے ہی پاس رکھ چکا تھا۔۔

پلے کا جیسے ہی پاؤں شکنجے سے نکلا وہ سکون میں آ گیا اور بس کی طرف دیکھ کر لنگڑاتا ہوا پاس پڑے مفلر پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

سورج کی پہلی کرنیں سامنے والی عمارت کے پیچھے سے نمودار ہوئیں ، پلے کی کالی کالی نمدیدہ آنکھوں پر سورج کی کرنیں پڑیں تو اسے پھر سے اُس عورت کی یاد آ گئی جو اوپر کوریڈور میں پڑی تھی، ساتھ ہی اسے ماں کی آنکھیں یاد آ گئی جو تین برس اولڈ ایج ہوم میں رہ کر مر چکی تھی۔۔۔۔

اس نے پلے کو بے دھیانی میں اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور بے اختیار چومنے لگا۔۔۔۔ بس میں بیٹھے بچوں اور ارد گرد جمع ہو جانے والے لوگوں نے یہ دیکھ کر تالیاں بجانی شروع کر دیں۔۔۔ایک عورت کی انکھوں میں تو آنسو آ گئے، وہ اپنے ہینڈ بیگ سے نشو نکال کر آنکھیں صاف کرنے لگی تو سب کے موبائلوں کے رخ اس کی طرف مڑ گئے لوگ کبھی کتے کے پلے کو فوکس میں لاتے کبھی اس کو پیار کرتے انسان کو اور کبھی آنکھوں سے آنسو صاف کرتی عورت کو۔

بس کچھ بچوں کو اٹھا کر آگے بڑھ گی ۔۔۔ اس نے بھی کتے کے پلے کو اٹھایا اور ریسٹورنٹ کی طرف چل دیا۔

ناشتہ کرنے کے بعد وہ کتے کو لے کے قریبی دکانوں کی طرف نکل گیا وہاں سے اس نے ایک خوبصورت سا پٹہ لیا، چمکتی ہوئی نفیس زنجیر لے کر چمڑے کے پٹے کے ساتھ لگا کر اسے اپنے نئے پالتو کتے جس کا نام اس نے لکی رکھ لیا تھا کے گلے میں ڈال دی۔۔۔ سردی سے بچانے کے لئے اس کو ایک اونی جیکٹ بھی لے کر پہنایا اور دونوں ٹہلتے ٹہلتے ایک سیٹی بجاتا اور ایک اُووں اُوووں کرتا گھر کی طرف چل پڑے۔

خوشی کے باوجود اس کے ذہن کے کسی گوشے میں ایک ہلکا سا کھٹکا بھی تھا کہ کہیں اس کی بیوی یا بچہ لکی کو ناپسند نہ کر دیں۔۔۔ یا اپنی بلڈنگ تک پہنچنے پر اس کا کوئی مالک نہ آجائے۔

جب وہ اپنے فلیٹ کے نیچے بنی مارکیٹ میں پہنچا تو بلڈنگ کے سویپر رات والا کوڑا کرکٹ اٹھا کر میونسپیلٹی کے ٹرک میں ڈال رہے تھے اکا دکا دکانیں کھل رہی تھیں ایک بار پھر سے گھما گھمی اور شور شرابے کا آغاز ہونے والا تھا۔

اچانک اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔۔۔۔۔

یہ اس کے انتہائی بے تکلف دوستوں میں سے ایک تھا

ارے اسے اس وقت کیسے یاد آگئی؟ یہ بڑبڑاتے ہوئے اس نے فون کان سے لگالیا

ارے یہ تُو ہے؟ تو ہی ہے نا؟، چھا گیا ہے ڈوڈ چھا گیا ہے تُو۔

دوسری طرف سے چیختی ہوئی آواز گونجی۔

کہاں ہوں میں ؟ کہاں چھا گیا بھئ ؟اس نے حیرت سے پوچھا۔

چل چل اب بن نہیں ، کیا وڈیو بنوائی ہے ظالم ! تین گھنٹے سے بھی کم وقت میں تیری وڈیو وائرل ہو گئی ہے ہر طرف بس تو ہی تو ہے۔

چل تو دیکھ اور انجوائے کر۔ دن کو ملتا ہوں دوسری طرف سے جواب سنے بغیر لائن کٹ گئی

اس نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے لکی کو خود سے آگے نکلنے کا راستہ دیا اور حیرت اور تجسس سے سوشل میڈیا کی مختلف سائیٹس یکے بعد دیگرے کھولنا شروع کر دیں۔۔۔۔ فیس بک ، یو ٹیوب ، انسٹا گرام۔۔۔۔اس کی اور لکی کی وڈیو واقعی جنگل میں آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔۔۔

موبائل کی سکرین کا رنگ بدلا اور اس کی بیوی کا نام اور نمبر نمودار ہوا

ہیلو اس نے ریسیو کا بٹن دبا کر فون کان سے لگتے ہوئے پر اشتیاق لہجے میں کہا

ہنی تم کہاں ہو ؟ ہمیں گھر پہنچے ہوئے بھی ایک گھنٹا ہو گیا ہے اور یہ وڈیو، کہاں ہے ہمارا ڈوگی ؟ تمہیں پتہ ہے کتنا مشکل ہے اتنے کیوٹ بوائے کا انتظار کرنا۔۔۔اوہ مائی گاڈ اتنی جلدی نائین تھاؤزنڈ لائکس ؟۔۔۔۔۔ آئم ایم پراؤڈ آف یو، ہنی۔۔۔ آئی ایم ریئلی پراؤڈ آف یو۔۔۔۔

جلدی آؤناں۔۔۔

اس نے فون جیب میں رکھ کر لکی کو ایک بار پھر گود میں اٹھالیا۔۔

سیڑھیوں کے اختتام پر اسے کوریڈور کے دوطرفہ موڑ پر کچھ آوازیں سنائی دیں۔

چند قدم آگے جا کر اس کے اپنے فلیٹ کی طرف بائیں مڑنے سے پہلے ہی دائیں موڑ سے اس کا ایک پڑوسی نمودار ہوا جس کے پیچھے موڑ پر اُسے ایک پولیس والے کی جھلک دکھائی دی۔۔۔ کیا ہوا؟اس نے لکی کا منہ چیسٹر کے اندر چھپاتے ہوئے دھیرے سے پوچھا۔

کچھ خاص نہیں ایک ہوم لیس عورت مری پڑی تھی ہمارے کوریڈور میں اس کی باڈی لے کے جا رہے ہیں۔

وہ موڑ پر پہنچ کر دائیں طرف دیکھے بغیر بائیں مڑا اور چند بوجھل سے قدم اٹھا کر ڈور بیل بجائے بغیر لکی کو گود میں اٹھائے اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔

رکھوالی

سنو ذرا ایک ماچس تو دینا۔۔۔۔۔

دیکھو بھئ ادھر بھی دیکھ لو۔۔۔۔۔۔۔ توبہ ہے،

چھوٹی موٹی چیز لینی ہو، تو پھر تو انتظار ہی کرتے رہو،

کریانہ سٹور پر کھڑی چھوٹے قد اور کپڑوں سے باہر چھلکتے، ہانپتے وجود والی عترت دوپٹے کا پلو ٹھیک ہونے کے باوجود دوبارہ کھول کر ٹھیک طرح سے اوڑھتے ہوئے بُڑبُڑائی۔

یکدم وہ اچھل کر رہ گئی، کوئی نوکیلی شے اُس کے کولہے کے واہیات حد تک پیچھے نکلے ہوئے حصے پر زور سے چبھی تھی۔

وہ بھنا کر پیچھے مڑی، رشیداں ہاتھ میں بالوں کی سوئی دبائے اُس کے بالکل ساتھ پیچھے کھڑی اپنے دانت دکھا رہی تھی۔

کیوں ری،،، بد معاش یہ ماچس خریدنے کا کون سا وقت ہے۔ بچے ناشتہ کر کے سکولوں کالجوں کو چلے گئے اور خصم تیرا گھر پر ہے نہیں، تو نے اِس وقت کون سی آگ جلانی ہے۔ رشیداں نے اپنے منہ پر ترچھا ہاتھ رکھ کر عترت سے سرگوشی کرنے کی بھونڈی سی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اِسی اثناء میں دُکان میں موجود بچے نے ترتو یعنی عترت کی طرف متوجہ ہو کر کہا، جی خالہ جی کیا چاہیئے آپ کو، عترت نے روپے کا سکہ اُس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا، ماچس چاہیئے اور کیا میں تیرا سارا اسٹور خریدنے آئی ہوں۔

بچے نے فوراً ماچس لا کر پکڑائی اور جان چھڑاتے ہوئے دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

عترت واپس مڑتے ہوئے رشیداں سے بولی تو نے کیا لینا ہے۔ نہیں کچھ نہیں میں نے کیا لینا، میں تو شاہدہ کی طرف جا رہی تھی تم پر نظر پڑی تو رُک گئی۔

اور تُو کدھر؟ رشیداں نے واپس ترتو سے سوال کیا،

جا تو میں بھی شاہدہ ہی کی طرف رہی تھی، لیکن دروازے سے نکلی تو پچھلی گلی کی وہ بال کٹی لڑکی نہیں ہے؟۔۔۔

ارے جس کی پچھلے مہینے شادی ہوئی تھی؟۔۔ بڑی بن ٹھن کے نکلتی ہے ۔۔۔رشیداں شاید سمجھ نہیں پا رہی تھی۔۔۔

اری حرامزاد جو گلی میں بھی اپنے یار کا ہاتھ پکڑ کر چلتی ہے۔ عترت نے جنجھلا کر کہا ۔۔۔

ہاں ہاں وہ چھوٹی چھوٹی موسمیوں والی۔ رشیداں نے لڑکی کا حوالہ پہچانتے ہوئے کہا۔۔

ہاں، ہاں وہی۔۔۔ وہ بڑی گھبرائی ہوئی سی جا رہی تھی میں اُس کے پیچھے چل پڑی سوچا پتہ نہیں کیا بات ہے کچھ پتہ تو چلے، لیکن جوان ٹانگیں زیادہ پھدکتی ہیں ناں، یہاں پہنچی تو وہ آگے نکل گئی میں نے سوچا اب آدھے رستے سے یکدم واپس مڑنا

اچھا نہیں لگے گا، ماچس خریدنے کا بہانہ کر لوں، باتیں کرتی کرتی دونوں شاہدہ کے گھر کی طرف جا رہی تھیں۔

اور سنا، کل بھاگی چلی آئی تھی شہدو کے گھر سے خصم کا فون سننے، کیا کچھ کہتا ہے۔ عترت نے بات چھیڑی۔ کہنا کیا ہے وہی حال احوال اور نصیحتیں۔ بچوں کی پڑھائی کا خیال رکھنا جا کے میری بہن کے گھر ہو آیا کرو، کیا کہیں گے اُس کے سسرالی کہ میکے میں کوئی ہے ہی نہیں خبر لینے والا۔ اب بھلا میں کیا پتہ کروں اُس حرام زاد کا ہٹی کٹی ہے کھا کھا کے کپا ہو رہی ہے، ہر دوسرے روز خاوند کے ساتھ کہیں نہ کہیں سیر سپاٹے ہو رہے ہوتے ہیں۔ کبھی پکنک اور کبھی شاپنگ۔ رشیداں نے عجیب حسرت بھرے لہجے میں بات کا جواب یا شاید بھڑاس نکالی۔

اچھا چھوڑو عترت نے بھی اُس کے دِل کو مزید ٹھیس پہنچانا مناسب نہ سمجھا۔

مجھ سے تو خصم کے فون کا پوچھتی ہے اپنی سناؤ کچھ سکون ملا، یا ابھی تک نیند کی گولیوں کے پتے کھا کر بھی نیند نہیں آتی۔ رشیداں نے بدلہ لیا

تر تو نے اُس کی طرف شکایت بھری نظروں سے دیکھا اور بولی تو میرا حال پوچھ رہی ہے یا میرا مذاق اُڑا رہی ہے۔

ابھی اُسے گئے ہوئے ہفتہ ہی تو گزرا ہے آ جائے گی نیند بھی آہستہ آہستہ اور سکون بھی۔

اپنا وقت یاد نہیں ہے جب تیرا فوج سے چھٹی آتا ہے تو کس طرح ہواؤں میں اُڑ رہی ہوتی ہے۔

جوڑے کے ساتھ کے جوتے پہنتی ہے اور ساری گلی میں تیری چوڑیوں کی چھن چھن مچی ہوتی ہے۔ وہ اُس کے خالی بازوؤں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

ان دنوں تو نہ مہندی ہاتھوں سے اترتی ہے اور نہ دنداسہ تیرے منہ سے جدا ہوتا ہے۔ رشیداں کے کان عترت کی طرف لگے تھے لیکن دھیان گلی میں سے گزرنے والوں پر تھا کہ کوئی ان کی سرگوشیوں کو بھی سن تو نہیں رہا۔

مگر جب مہینہ لگا کر واپس چلا گیا تو یاد ہے دس پندرہ دِن تک تو شہدو کے گھر میں بیٹھ کر بھی تجھ سے بات نہیں ہوتی تھی۔

گم صم اور بالکل نئی نئی بیوہ کی طرح لگتی تھی۔

تیرا تو پھر بھی، اپنے ملک میں تو ہے ناں میرا تو سات سمندر پار گیا ہوا ہے عترت نے سرد آہ بھر کر کہا۔۔۔

اب آئے گا بھی نصیبوں سے اور پتہ نہیں اگلے پھیرے تک وہ بات رہتی بھی ہے یا نہیں پچاس کا تو ہو چکا ہے اب آئے گا تو اپنی لاش سنبھالے گا یا مجھے، وہ ایسے بولتی چلی گئی جیسے سارا غبار نکالنے کے لئے اُسے کسی کی تلاش تھی۔

اچھا چھوڑو ناں بہن، ہم دونوں ایک دوسرے کا کیا مذاق اُڑائیں گی، خود ایک چلتا پھرتا مذاق ہی تو ہیں، رشیداں نے بات بدل ڈالی۔۔

ارے یہ دیکھو یہ کون نکل رہا ہے شہدو کے گھر سے، بڑا جان جتنے والا ہے بھئی جو کوئی بھی ہے، دیکھ ہمیں دیکھتے ہی ایک دم گلی مڑ گیا ہے، حرامی نے منہ بھی نہیں دیکھنے دیا اپنا۔ دونوں تیز تیز قدموں سے شاہدہ کے دروازے کی طرف بڑھنے لگیں۔ دونوں کے دِل میں ایک ہی بات تھی، آج تو باتوں کا مزا آئے گا، آج رنگے

ہاتھوں پکڑ لیا ہے شہد و کو۔ عترت نے شاہدہ کے دروازے پر واجبی سی دستک دی اور دونوں اندر داخل ہو گئیں۔

شاہدہ اپنی تینوں سہیلیوں عترت، رشیداں اور نرگس سے عمر میں چھوٹی تھی اور سب سے آخر میں اِن کی سہیلی بنی تھی۔ اُس کی عمر لگ بھگ چھتیس سال تھی، خاوند دو سال پہلے فوت ہو چکا تھا شاہدہ اپنی ساس، ایک نند جو کہ پاگل تھی اور دو بیٹوں کے ہمراہ رہتی تھی، ایک بیٹی بھی تھی جس کی شادی خاوند کی زندگی میں ہی کر چکی تھی۔ بڑا بیٹا جو قریب بیس سال کا تھا ایک آٹو ورکشاپ میں کام کرتا تھا، گو آمدن واجبی سی ہی تھی۔

اُس چھوٹا آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ساس جس کی دو آپریشنوں کے بعد نظر تقریباً ختم ہو چکی تھی چھت پر بنے ایک کمرے میں رہتی تھی، نند کبھی اوپر کبھی نیچے کبھی گلی میں اور کبھی تین تین دِن کمرے میں رہتی تھی۔

دونوں شاہدہ کے گھر داخل ہوئیں تو اندر نرگس کو بھی موجود پایا، نرگس کو دیکھ کر دونوں کو سخت جذباتی دھچکا لگا جیسے شاہدہ کی چوری کے امکانات بالکل معدوم ہو گئے تھے۔

عترت سے پھر بھی نہ رہا گیا آنکھ دبا کر شاہدہ سے بولی یہ کون تھا۔ ظالم ہمارا تو بتا دیتی اُسے۔ ہم سے بھی منہ چھپا کر نکل گیا۔

رشیداں، ترتو کی بات کاٹ کر بولی اے بہن جو بھی تھا مگر تھا کڑیل جوان یہ چھ فٹ قد اور چوڑے چکلے شانے، کسی کو بھینچے تو ہڈیاں ہی توڑ دے اُسے کی۔
شاہدہ کی جگہ نرگس ہنس کر بولی، حرام زادیو تم دونوں کی ماں کا یار میٹر ریڈر تھا۔ بجلی کا میٹر دیکھنے آیا تھا کوئی اِس کا کنکشن لگانے نہیں آیا تھا۔ چاروں ہنسنا شروع ہو گئیں۔

ترتو ہنستے ہنستے ہوئے قدرے سنجیدہ ہو کر بولی، مڑے شہدو ہنس تو ہم رہی ہیں مگر ہے سب کچھ تیرے ہاتھ میں، تو کیوں نہیں ہمت کرتی کیا باقی کی زندگی اِسی طرح لوگوں کے کپڑے سیتے گزارے گی ابھی تیری عمر ہی کیا ہے صرف پینتیس چھتیس سال۔

رشیداں اُس کے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی اور لگتی تو تُو پچیس چھبیس کی ہے۔
ہم تو مجبور ہیں نہ عمر رہی نہ کوئی حال اور اوپر سے خاوند کا اسٹیکر بھی لگا ہوا ہے عترت نے بات جاری رکھی، ہمارا تو کام ہی خاوندوں کے بچوں اور ماں بہن کی رکھوالی کرنا ہے، جب اپنی زندگیاں اپنی مرضی سے گزار کر یا اپنی ذمہ داریاں پوری کر کے واپس آئے تو سب کچھ پھر اُن کا اور ہم فارغ۔

ویسے یہ پھاپھاں کٹنی کہتی ٹھیک ہے، شیداں نے ترتو کی طرف اشارہ کر کے پھر لقمہ دیا۔

ہے تو یہ رکھوالی ہی چاہے مکانوں کی کہہ لو بچوں کی کہہ لو یا نرگسو کی طرح نام لگ جانے کی کہہ لو جس کے بدلے ہمیں خاوندوں کی طرف سے کپڑا لتہ اور دو وقت کا کھانا مل جاتا ہے۔

ترتو نے پھر سلسلہ کلام شروع کیا، خاوندوں والی ہوتے ہوئے بھی بیوہ بلکہ ہر دو چار سال بعد شادی اور پھر بیوگی کی زندگی گزار رہی ہیں مگر تیرا سائیں تو رہا ہی نہیں تو کیوں زنجیریں پہن کر بیٹھ گئی ہے۔ شہدو، ترتو کی بات کاٹ کر غصے سے بولی۔ گشتی، بدمعاش میرے بچوں کو زنجیریں کہتی ہے اور خود جن کی رکھوالی کر رہی ہے وہ کیا ہیں اور پھر ترتو کے سہم جانے پر خود ہی دھیمی پڑ کر لمبی سی سانس چھوڑتے ہوئے بولی، ویسے باجی کہتی تو تُو بھی ٹھیک ہی ہے، عمر اور کاشف دونوں ہمیشہ اپنی دادی کی طرف داری ہی کرتے ہیں اور عمر تو بات بات پر مجھے ٹوک بھی دیتا ہے جیسے باپ کے مرنے کے بعد اب وہ میرا خاوند ہے۔
کوئی گھر میں آ جائے یا کبھی مجھے گلی میں دیکھ لے تو ایسی خونخوار نظروں سے دیکھتا ہے کہ کبھی کبھی تو مجھے ڈر لگتا ہے کہیں ہاتھ ہی نہ اٹھا دے، کبھی میں سوچتی ہوں جب یہ دونوں بھی لڑکیاں لے آئے اور اسلم کی امی بھی گزر گئی تو مجھے تو اپنی پاگل پھوپھو کے ساتھ ہی رکھیں گے۔ پھر خود ہی سر جھٹک کر بولی نہ اے باجی چھوڑ۔۔۔
اِس معصوم کاشف کو کس کے سہارے چھوڑوں اور اسلم نے مجھ سے اپنی پاگل بہن کا ساری عمر خیال رکھنے کا وعدہ بھی تو لیا تھا۔ ویسے بھی دوسری بار کا انجام یہ نرگسو ہمارے سامنے ہے اِس کا خاوند جب اِسے گاؤں سے پہلے والے کے گھر سے بھگا کر

ہمارے محلے میں لایا تھا تو کیسے اِس کے پاؤں کے نیچے ہاتھ رکھتا تھا اور کورٹ کچہری کا بھی سارا مسئلہ ہنسی خوشی نمٹاتا تھا اور اب چھ چھ مہینے اِس سے منہ ہی نہیں لگاتا کمینہ، نہ پرواہ کیا پہنتی ہے کہاں سے کھاتی ہے اور نہ فکر کے کہاں گئی ہے کہاں سے آئی ہے۔

نرگسو کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے اور اُس کے منہ سے جیسے بے خیالی میں نکلا اب نئی جو مل گئی ہے۔ اُس ماں کو چاٹے یا میرا خیال رکھے، مجھ موئی پر بھی عشق کا بھوت چڑھا تھا ناں اُس وقت، حرامی میرے خاوند کا نوکر تھا بس باتوں میں آگئی اور کچھ اُس کے ظلم سے جان چھڑانے کی جلدی بھی تھی۔ اب کہتا ہے، طلاق بھی نہیں دوں گا اِس کے ساتھ میرا نام لگا ہے، یہ میری عزت کی رکھوالی ہے بس بیٹھی رہے، اُس کی آنکھیں خشک تھیں مگر پھر بھی اُس نے ایسے صاف کیں جیسے نمی آ گئی ہو۔

پھر وہ گلاس اٹھا کر کولر کی طرف جاتے ہوئے بولی میرا بھی نام نرگسو ہے رکھوالی تو میں بھی خوب کر رہی ہوں۔ کیا یاد کرے گا، وہ اُدھر تو کوئی اور اِدھر۔ عترت، پاس سے گزرتی ہوئی نرگھس کے کولہوں پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی ست خصمی تیری دکان میں ابھی سامان ہے ناں بیچنے کے لئے ہم تو اِس سے بھی رہیں۔

رشیداں جو کافی دیر سے خاموش بیٹھی تھی سلائی مشین کے اندر باہر ہوتے ہوئے گز پر نظریں گاڑھے بے خیالی میں ایک عجیب حسرت بھرے لہجے میں بولی ہماری

بھی کتنی عجیب زندگی ہے۔ عام عورتیں جس کام کی زیادتی کے لئے اپنے شوہروں کی شاکی رہتی ہیں یا جس کے زور پر ناز نخرے اٹھواتی ہیں ہم سہاگنیں ہوتے ہوئے بھی اُس کے لئے ترستی ہیں۔ شہدو تُو تو دو سال ہوئے بیوہ ہوئی ہے مگر ہمیں تو اتنے سال ہوگئے کہ ہمیں یاد بھی نہیں۔ تجھے تو چل صبر آگیا ہوگا مگر ہمارے بارے میں سوچ، نہ کوئی ناز اٹھانے والا نہ منانے والا، ساون کے دِنوں میں، جاڑے کی راتوں میں عیدوں شب براتوں پہ ہم بیوہ ہوتی ہیں اور جب کچھ بھی نہیں ہوتا یا تھوڑا صبر آ بھی جاتا ہے تو ہم سہاگنیں بن جاتی ہیں۔ ہمیں یقین آنے تک ہم ایک بار پھر بیوہ ہو چکی ہوتی ہیں۔ نرگسو نے پانی کا گلاس منہ سے ہٹا کر گود میں رکھ لیا اور دونوں ہاتھوں سے اُسے دبانے لگی۔ عترت کی نگاہیں رشیداں کے متحرک لبوں پر ٹک سی گئیں اور شاہدہ کے ہاتھ میں سِلتی ہوئی شلوار کا سارا کپڑا اکٹھا ہو گیا۔

رشیداں کی بات ابھی جاری تھی۔ مجھے تو کبھی کبھی اپنے آپ سے اور تم لوگوں سے بھی نفرت سی ہونے لگتی ہے۔ ہم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہیں۔ ہم اپنے بیٹوں کی عمر کے لڑکے کو بھی دیکھ کر کمینی سوچوں میں گم ہو جاتی ہیں۔ کبھی تو ہم سلائی مشین کے چلتے ہوئے گز کو دیکھ کر، سوئی میں دھاگہ ڈالتے ہوئے، آٹا گوندھتے ہوئے، کرسی کے پائے دھوتے ہوئے، دراز بند کرتے ہوئے یا ہنڈیا ہلاتے ہوئے بھی سانسیں بے ترتیب کر کے خیالوں کی دنیا میں گم ہو جاتی ہیں اور کبھی برف کی سل کی طرح ہو جاتی ہیں، ہمیں یاد ہی نہیں رہتا کہ ہم عورتیں ہیں۔ میں سوچوں تو خیالوں ہی میں اپنے آپ پر تھوکنے کا دِل کرتا ہے کہ ہم کسی عورت

کی پٹائی کی خبر سُن کر، کسی کی طلاق کا پتہ چلا کر یا کسی کنواری کا کوئی چکر پکڑ کر اِس لئے خوش ہوتی ہیں کہ ہم ہر عورت سے جلتی ہیں ، ہم کسی کی خوشی ، کسی کا نہانا برداشت ہی نہیں کر سکتیں۔ نرگسو کی آنکھوں میں نمی اب واضع دِکھائی دے رہی تھی۔

یکدم شاہدہ اٹھی اور رشیداں کے کاندھے پر چٹکی کاٹتے ہوئے بولی بد معاش تو کسی سکول میں استانی لگ جا۔ بند کر اپنی بکواس میں چائے بنا کر لاتی ہوں تو ذرا اِس شلوار کو کھڑا کر دے۔

عترت کو آہستہ آہستہ دوبارہ نیند آنے لگی، ہاں گولیاں کھانے کی وجہ سے اُس کا رنگ کچھ مزید پیلا پڑ گیا تھا اور پیٹ بھی پہلے سے زیادہ پھول گیا تھا۔ ایک معمولی سی تبدیلی ضرور آئی تھی کہ عترت جب بھی گلی محلے کے بچوں کو کھیلتا دیکھتی تو انھیں گھر میں بلا لیتی اور ٹی وی لگا کر خود بھی اُن کے ساتھ بیڈ پر نیم دراز ہو کر دیکھتی رہتی ، کبھی کبھی وہ کسی لڑکے کو بہت پیار کرتی اور اُسے بہت دیر تک گود میں اچھالتی رہتی یا پاس ہی لٹا لیتی۔ نرگسو کی نند کچھ دن کے لئے اپنے بھائی کے گھر رہنے کے لئے آئی ہوئی تھی اس لئے وہ اپنی ملاقاتیں اب شہدو کے گھر میں کرنے لگی تھی ایک دو بار شہدو نے انکار کیا کہ میرے بیٹے کو بھنک بھی پڑ گئی تو کہرام مچ جائے گا اور ویسے یہ تیرے والا لڑکا ہے بھی چھوکرا سا خود ہی اپنے دوستوں کے سامنے کہہ دے گا اور بات پورے محلے میں پھیل جائے گی مگر پھر نرگسو کی منت سماجت کی وجہ سے اس شرط پہ مان گئی کہ تُو ہفتے میں ایک آدھ بار میرے بیٹے کے ورکشاپ جانے کے کم از کم دو گھنٹوں بعد اور عترت، رشیداں کے چکر لگانے سے پہلے کے ایک گھنٹے میں ہی آ سکتی ہے، بیٹھک میں بیٹھ جایا کر، وہ وہیں باہر کے دروازے سے آئے اور ادھر سے ہی واپس نکل جائے تب تو کنڈی چڑھا کر اندر کی طرف سے دروازہ کھول لیا کر۔

شاہدہ نے اپنی بیٹھک کی کھڑکی میں بجلی کے پلگ کے لئے ایک سوراخ بنادیا تھا جب نرگھس اندر ہوتی تو شاہدہ بھی کھڑکی سے ہی جڑی رہتی اور پھر دوپہر کا کھانا بنانے سے پہلے نہا لیتی۔

دو تین مہینوں سے محلے میں کوئی نئی خبر نہیں تھی۔ نہ کوئی سرگوشی نہ کسی کے پیچھے چل کر سٹور سے ماچس خریدنا۔ نرگسو کی نئی ملاقاتوں کا راز ابھی اُس کے اور شاہدہ کے درمیان ہی تھا شاید اِس لئے کہ دونوں کا کام چل رہا تھا چاہے نوعیت الگ الگ تھی۔ رشیداں کے خاوند کو اگلے مہینے چھٹی ملنی تھی وہ ہر روز کسی نہ کسی تیاری کا بتاتی جِسے سن سن کر باقی تینوں کے اب کان پک چکے تھے۔ عترت کو کبھی کبھی شک کا دورہ پڑتا کہ شاید اُس کے خاوند نے سعودیہ میں بھی شادی کر رکھی ہے مگر اب اُس نے اِس سلسلے میں زیادہ پریشان ہونا چھوڑ دیا تھا اُسے معلوم تھا کہ اگر کی ہوئی بھی ہے تو اب وہ عمر کے اِس حصے میں ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے واپس میرے پاس ہی آئے گا۔

ایک دِن نرگو اپنے اُسی کام کے سلسلے میں شاہدہ کے گھر کی طرف جا رہی تھی ابھی کچھ وقت پڑا تھا اِس لئے وہ بڑے سکون سے تانک جھانک کرتی گلی کا موڑ مڑی۔ شاہدہ کے گھر کے باہر کچھ لوگ کھڑے تھے ساتھ والے گھروں کی عورتیں اندر داخل ہو رہی تھیں اُس نے دیکھا کہ عترت اور رشیداں بھی چادریں لپیٹے سہمی ہوئی سی چلی آرہی ہیں تینوں اکٹھی ہی دروازے کے پاس پہنچیں۔ بجائے کچھ بولنے کے عترت اور رشیداں دونوں نے نرگسو کی آنکھوں میں دیکھا اور گھر کے اندر داخل ہو گئیں۔ صحن میں چارپائی پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی جس پر شاہدہ کی لاش پڑی

تھی۔ اُس کا گلا بڑی بے دردی سے کاٹ دیا گیا تھا۔ شاہدہ کی بوڑھی ساس ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے نیم دراز پڑی تھی جبکہ چھوٹا بیٹا جس کو ابھی کوئی سکول سے لایا تھا سکول یونیفارم میں ہی ماں کے پاؤں کے پاس زمین پر سہما بیٹھا تھا۔ ایک بوڑھی عورت نرگسو کے کان کے پاس منہ کر کے بولی شاہدہ کے بڑے بیٹے نے اُسے ذبح کر دیا ہے۔ کام پر گیا اور پرس گھر بھول جانے کی وجہ سے راستے سے ہی واپس آ گیا تھا۔ شاہدہ کسی کے ساتھ بیٹھک میں تھی۔ سارے جسم پر چھریوں کے نشان ہیں۔ ہاتھ تو بالکل بوٹی بوٹی ہو رہے ہیں۔ شاید چھریوں کے وار روکتی رہی بیچاری۔

نرگسو گھر والوں کو بلانے کے لئے واپس مڑی، بیٹھک کے دروازے کے پاس بجلی کے میٹر کا ریڈنگ کارڈ پڑا تھا جس پر اس مہینے چار بار ریڈنگ درج کی گئی تھی۔

دھاگے

وااااااااعلیکم سلاااااااااااام

آؤجی ی ی ی،

کیسی گزررہی ہے؟؟؟

اورسنائیں؟؟

بیوی بچے؟؟

اورسنائیں؟؟

صحت کیسی ہے؟؟

اورسنائیں؟؟

میرے دکان پر داخل ہوتے ہی اور میرے سلام کرنے سے بھی پہلے، حسب معمول، کریم نے اپنی لمبی ناک کی نوک پر ٹکی نظر کی عینک کے اوپر سے نظریں ملاتے ہوئے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں بھینچ لیا اور پھر اُسے مسلسل ہلاتے ہوئے جیسے جبراً میرا سارا حال احوال معلوم کر لیا۔

عرفی نہیں پہنچا؟ میں نے برسوں کے استعمال کی وجہ سے میل سے چمکتے ہوئے لکڑی کے چھوٹے سے بنچ پر سے دھاگوں کے ٹکڑے نیچے گرائے اور دوسرے سرے پر پڑے پانی کے کولر کے لڑکھڑانے کا دھیان رکھ کر احتیاط سے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ نہیں ابھی نہیں پہنچا۔

شاید آہی رہا ہو۔

اور واصف کی کوئی خبر ؟ کیا آج آئے گا ؟۔۔۔۔۔

عرفی سے تو فون پر میری بات ہوئی تھی پر واصف سے کل سے بات نہیں ہوئی

میں نے دوسرا سوال کیا

ہاں واصف ادھر ہی تھا ابھی کسی کام سے گھر گیا ہے کہہ رہا تھا تیس چالیس منٹ تک واپس آتا ہوں۔

پرانی دیواریں، نیچی چھت، فقط خود کو ہوا دینے والا پرانا سیلنگ فین، تین دیواروں پر لگی شیلفیں (جن میں ٹھونسے نئے پرانے کپڑے آدھے باہر لٹک رہے ہوتے اور کچھ کونوں میں پڑے پڑے بوسیدہ ہو گئے تھے) اور چوتھی طرف شیشے کی دیوار جس کا آدھا حصہ شو کیس کا طور پر استعمال ہوتا تھا اور آدھا حصہ دروازے کے طور پر۔

یہ ٹیلرنگ شاپ ہم دوستوں کی بیٹھک بھی تھی اور ہمارا چائے کا ہوٹل بھی۔

کریم نے کچھ عرصہ پہلے اچانک داڑھی رکھ لی تھی اور آج اُسے دیکھ کر نجانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ اب اُس نے داڑھی کی تراش خراش بھی ترک کر دی ہے اور اس کو بے مہار بڑھانا چاہتا ہے وہ کچھ دیر بعد بے دھیانی میں اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا اور بالوں کے آخری سروں کو جو اب اُس کی شرٹ کے دوسرے بٹن کو چھو رہے تھے اپنی انگلیوں کی پوروں میں محسوس کر کے چھوڑ دیتا۔

کریم کا شاگرد حسب معمول کمر ضرورت سے زیادہ اکڑائے اور گردن ضرورت سے زیادہ جھکائے اپنی لمبی چوڑی میز پر اپنے کام میں مگن تھا۔ مجھے کریم کے شاگرد

سے زیادہ اُس کی میز پر پڑے اُس کپڑے کے ٹکڑے سے دلچسپی رہتی جس سے وہ نئے سلے کپڑوں کو پہلی بار استری کرنے اور اُن پر پہلی سلوٹ بٹھانے کا کام لیتا۔
وہ اُس کپڑے کے ٹکڑے پر بار بار پانی لگاتا اور پھر اُس کو نئی سلی قمیض کے کالر، کف یا بٹن پٹی پر رکھ کر اُس پر اُس وقت تک گرم استری رگڑتا رہتا جب تک بھاپ نکلتی رہتی یا کپڑے کے نیچے پڑی قمیض کی سلائی ہموار نہ ہو جاتی
چائے منگواؤں؟ کریم نے اپنے سامنے پڑی میز پر بچھے ادھ سلے کوٹ پر سے گردن اوپر اٹھا کر کمر سیدھی کرتے ہوئے پوچھا۔
میرا دھیان کریم کی گردن کے عین پیچھے دیوار پر لگی شوکیس نما الماری پر تھا جس سے سلے اور ان سلے کپڑے لپک لپک کر باہر نکلنے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے اور مجھے ہمیشہ ڈر لگا رہتا کہ کریم بے دھیانی میں جب اچانک کمر سیدھی کرے گا تو اُس کا سر ضرور الماری کے کنارے سے ٹکرا جائے گا۔
نہیں۔۔۔ دونوں آ جائیں تو پھر پیتے ہیں، میں نے پاس پڑے دو تین جگہ سے ٹوٹے میلے کولر سے ہونٹوں کے کنارے کاٹنے والا سٹیل کا پرانا گلاس پانی سے بھرتے ہوئے جواب دیا۔
کریم ہمارا دوست نہیں تھا لیکن تھا بھی۔۔۔ اصل میں ہماری دوستی کریم کے بھائی سلیم سے تھی جس کی یہ ٹیلرنگ شاپ تھی، پھر سلیم کا ویزا لگ گیا اور وہ دبئی چلا گیا اور کریم نے یہ دکان سنبھال لی۔۔۔ ہم چار پانچ دوست سلیم کے پاس آیا کرتے تھے تقریبا روزانہ ہی کسی نہ کسی دوست کا دکان پر چکر لگتا لیکن ہفتے میں ایک دو بار یا چھٹی کی رات تو سب کے سب لازما اکھٹے ہوتے اور دیر تک گپ شپ، کھانا

اور کبھی کبھار کریم کے شاگرد کے چھٹی کر جانے کے بعد اُس کی لمبی میز پر تاش کی بازی جمتی۔

میری نظر غیر ارادی طور پر کریم کی دکان کے فرش پر ہر طرف بکھرے دھاگوں کے ٹکڑوں میں سے ایک پر رُک گئی، میں جب بھی کریم کی دکان پر آ کر بیٹھتا مختلف رنگوں اور لمبائی کے، مختلف انداز اور زاویوں سے جابجا بکھرے، لپٹے، چپکے، لٹکے اور پھنسے ہوئے دھاگوں کے یہ ٹکڑے میری داخلی کیفیت کے مطابق مختلف شکلیں بدلتے رہتے اور اپنے رنگوں اور زاویوں کی زبان میں مجھ سے باتیں کرتے رہتے۔

ایک کالا دھاگہ ہانپتا ہوا آگے آگے بھاگ رہا تھا اور مختلف رنگوں کے بہت سے دھاگے سرپٹ اُس کے پیچھے لگے ہوئے تھے، دو سفید دھاگے تو جیسے اُس کے سر پر پہنچ چکے تھے اور اُسے دبوچنے ہی لگے تھے۔ میں نے کالے دھاگے کے ٹکڑے کو غور سے دیکھا تو اُس کے درمیان میں ایک سرخ رنگ کا رُواں سا دہک رہا تھا اور شاید اسی لئے سب دھاگے اُس کو دبوچنے کے لئے اُس کی طرف لپک رہے تھے۔

ابھی یہ بھاگ دوڑ جاری تھی کہ کریم کی دکان سے چند قدم کے فاصلے بنی پانچ دکانوں کی چھوٹی سی مارکیٹ کا مالک دکان میں داخل ہوا۔

آؤ جی ی ی ی۔۔۔ عمر حیات صاحب، کریم نے حسب معمول اُس کے بولنے سے پہلے اُس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ساتھ ہی، اور جی، اور جی کی رٹ کے بیچ اپنے شاگرد کو چائے لانے کا اشارہ بھی کر دیا۔ اس دوران کریم کی گرم استری کوٹ کے

کالر پر ٹکی رہی جس کے نیچے کپڑوں پر پہلی سلوٹ بٹھانے والا پرانا جلا ہوا کپڑے کا ٹکڑا بھاپ دے رہا تھا۔

عمر حیات خوش پوش، متمول اور سماجی سا انسان تھا، کچھ کاروبار تھا پانچ سات دکانیں تھیں اور اسی سڑک پر اپنی دکانوں کے اوپر بنے مکان میں ہی رہائش پذیر تھا۔ کریم کی وجہ سے ہم سب دوستوں کی بھی اُس سے گپ شپ ہوتی رہتی۔

کیا کریم بھائی! میرا کام تو آپ کراتے نہیں اور حال احوال ایسے پوچھتے ہو جیسے سب دکھ دور کر دوگے۔ کریم نے اُس کا ہاتھ پکڑے پکڑے ہی بات میری طرف اچھال دی،

لو جی اکبر بھائی، آپ کو پتہ ہے عمر حیات صاحب ہمارے بھائی اور اس سڑک کی ایک معزز شخصیت ہیں، آپ نے ان کے لئے کوئی رشتہ ڈھونڈنا ہے بس۔ اور ڈھونڈنا بھی ہفتے دس دنوں میں ہے۔

عرفی کا دوستی کے علاوہ میرے ساتھ سابقہ پڑوسی اور ایک بھائی جیسا رشتہ بھی تھا۔ وہ عمر کے فرق اور میری اُس کے والد صاحب سے بھی علیک سلیک کی وجہ سے میری موجودگی میں میری بات کو رد نہیں کرتا تھا اور نہ اپنی جذباتی طبیعت کو بے قابو ہونے دیتا تھا۔ لیکن دوستی کی وجہ سے بات تُوتڑاک سے ہی کرتا تھا۔

میرے ذہن میں عرفی کی بات گونج گئی، یار اکبر، میرے پڑوس میں ایک لڑکی ہے یار، بڑے اچھے لوگ ہیں اور لڑکی بھی خوبصورت، پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی ہے لیکن رشتہ نہیں ہو پا رہا، لوگوں کی بیمار سوچ کی وجہ سے بیچاری کی عمر نکلتی جا رہی ہے یار کوئی اچھا گھر نظر میں ہو تو بتا دینا۔

میں نے پہلے سوچا عرفی کو آنے دوں، پھر، عمر حیات کی منتظر نظریں اور کریم کا اُس کا ہاتھ پکڑے پکڑے ادھ کھلے منہ سے اپنی جان چھڑانے کے لئے میرے جواب کا انتظار دیکھ کر عمر حیات کو اپنے پاس بنچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا وہ ایک دم سے چوکنا ہو کر میرے ساتھ چپک کر بیٹھ گیا۔

عمر حیات صاحب دیکھیں آپ کی ماشاءاللہ بیالیس چوالیس کے قریب عمر تو ہو گی، شادی بھی تھی، بچے بھی ہیں کیا لڑکی تھوڑی عمر والی ہو اور جہیز وغیرہ نہ لا سکے تو چلے گا میرا خیال تھا کہ عرفی کی پڑوسن کا رشتہ جہیز کی وجہ سے نہیں ہو رہا ہو گا، اس لئے میں پہلے ہی عمر حیات کو ذہنی طور پر تیار کر دینا چاہتا تھا

ارے کیوں نہیں بھائی صاحب ب ب ب ۔۔۔۔ میرے تین بچے ہیں اور اب تو کاروباری مصروفیات کی وجہ سے صحت بھی کچھ اچھی نہیں رہتی، مجھے جہیز کی کوئی خاص ضرورت نہیں اور عمر پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے اگلے بیس تیس منٹ میرے، عمر حیات اور کریم کے درمیان اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی اور میں نے محسوس کیا کہ عمر حیات آدھے گھنٹے میں ہی اتنے خواب و خیال بُن چکا تھا کہ اب وہ خود کو دوبارہ سے شادی شدہ سمجھ رہا تھا۔

میری بدقسمتی کہ چائے کا کپ ابھی آدھا ہی پیا تھا کہ عرفی آ گیا۔ عمر حیات اور کریم نے اُسے سانس بھی نہ لینے دی اور رشتے کی بات چھیڑ دی۔

عرفی نے میری طرف دیکھا پھر کچھ دیر عمر حیات کی طرف دیکھتا رہا، پھر کریم کے چہرے پر نگاہیں جما دیں اور پھر بڑے محتاط انداز میں بولا

کریم بھائی بہت اچھا گھرانہ ہے ہمارے پڑوسی ہیں، لڑکی خوبصورت اور پڑھی لکھی ہے۔۔۔۔۔۔۔

تو پھر ابھی تک شادی کیوں نہیں ہوئی، کریم نے اُس کی بات کاٹ کر کہا

اصل میں لڑکی کسی سے پیار کرتی تھی، پسند کی شادی کی خواہش مند تھی، گھر والوں کو بھی کچھ پس و پیش کے بعد کوئی اعتراض نہ تھا لیکن وہ کم ظرف لڑکا کچھ ماہ لڑکی کے ساتھ بات چیت میل ملاقات کر کے چلتا بنااور پھر کہیں اور شادی کر لی۔ عمر حیات کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ میری نظر دوبارہ لال روئیں والے کالے دھاگے کے ٹکڑے پر جا پڑی۔ لیکن اب

شاگرد کی میز کے ایک پائے کے پاس کچھ سفید دھاگے ایک طرف جمگھٹا بنائے اپنے سامنے دوسری طرف مجمع لگائے کالے دھاگوں کو خونخوار نظروں سے دیکھے جا رہے تھے جبکہ دونوں گروہوں کے وسط میں ایک کالا دھاگہ ایک سفید ڈوری سے ایسے لپٹا ہوا تھا جیسے کوئی اس سے وہ ڈوری چھین رہا ہو اور وہ کسی قیمت پر اسے خود سے جدا نہیں ہونے دینا چاہتا ہو۔

عمر حیات نے اپنی مونچھوں کے نیچے سے اپنے ہونٹوں کے کناروں کو انگلی اور انگوٹھے سے دبا کر صاف کیا اور چہرے کو واپس پہلی حالت میں لانے کی بجائے اسی طرح لٹکا اور قدرے بگڑا ہوا ہی رہنے دیا۔

مجھے لگا عمر حیات کہنا چاہ رہا تھا اس طرح کے بدذات مرد ہوتے ہیں ہر جگہ لیکن لڑکی کو کس جرم کی سزا مل رہی ہے، آج ہی چلو اور میرا پیغام اُس کے گھر والوں کو پہنچا دو

لیکن یہ صرف میرا خیال تھا۔۔۔اور بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ خاصا احمقانہ خیال تھا۔۔۔

عمر حیات کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، آنکھیں غیض و غضب اگل رہی تھیں۔۔۔۔ وہ بلند آواز میں بولا

او کریم !!! تم نے مجھے کیا سمجھا ہوا ہے ؟ میں بے غیرت ہوں ؟ میں ایک اوباش عورت سے شادی کروں گا جو پہلے ہی کہیں گلچھرے اڑا چکی ہے۔ پھر وہ میری طرف مڑا۔ اکبر صاحب مجھے آپ سے یہ امید نہ تھی، کیا آپ ایک غیرت مند مرد کے جذبات کو سمجھتے بھی ہیں ؟ یا نہیں۔۔۔ ایک جوٹھا برتن جس مین ایک کتا منہ مار کر چلا گیا آپ مجھے اُس میں کھانا کھانے کا کہہ رہے ہیں، آپ تو پڑھے لکھے بنتے ہو، کیا آپ اُس کرب کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔۔۔۔۔ یا شاید آپ کو علم ہی نہیں ہے کہ اُس وقت ایک غیرت مند مرد پر کیا بیتتی ہے جب وہ اپنی بیوی کے جسم کو چھوئے تو اُسے یہ علم ہو جائے کہ مجھ سے پہلے ہی کوئی اس کو استعمال کر چکا ہے میں اُس کو کیسے اپنا سکتا ہوں، کیسے چھو سکتا ہوں، کیسے اپنی عزت بنا سکتا ہوں۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ میں بالکل خالی الذہن ہو کر ہونقوں کی طرح عمر حیات اور کریم کا منہ تکتا رہ گیا۔

میرے بالکل سامنے کریم کی میز سے فرش تک لٹکتے موٹے میلے کپڑے پر چند باریک اور نہایت چھوٹے دھاگوں کے ٹکڑے ادھر ادھر دیکھتے ایک بڑے دھاگے کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے جو نجانے انھیں کہاں لے کر جا رہا تھا۔ شاید عرفی اُس لڑکی کو پڑوسی ہونے کی وجہ سے اپنے گھر کی لڑکیوں جیسا خیال کرتا تھا میرا

ہاتھ عرفی کے کندھے پر تھااور میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ غصے سے کانپ رہا ہے میں نے اُس کے ہاتھ کا بار بار مکے کی شکل میں آنا اور پھر شانے پر میرے ہاتھ کے دباؤ کی وجہ سے ڈھیلا پڑنا دیکھا تو میں موقعے کی نزاکت کے تحت اٹھ کر عمر حیات کو بازو سے پکڑ کر باہر لے گیا۔

باہر نکل کر مجھے احساس ہوا کہ دکان کے اندر عمر حیات کی غیرت کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر کھولی جانے والے چھتری کی طرح ادھ کھلی رہ گئی تھی جو سڑک پر آتے ہی اپنے پورے وجود کے ساتھ اس پر چھا چکی تھی۔

یہ لڑکا عرفی پیچھے سے ہے کون جی، ذرا مجھے اس کا پورا اتا پتا تو بتائیں، ہم بھی تو دیکھیں کہ ہمیں بے غیرت سمجھنے والا خود کیا شے ہے۔

عمر حیات بھائی اس نے تو ایک کار خیر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔میری بات ادھوری ہی رہی گئی،او کار خیر نہیں بادشاہو دلالی کہو نہ سیدھا، آپ پڑھے لکھے لوگوں کا یہی مسئلہ ہوتا ہے کہ آپ بات کو گھما پھرا کر کرتے ہو۔

ارے نہیں ایسا کچھ نہیں ہے، آپ شاید غلط سمجھ رہے ہیں، میں نے اس کے شانے پر ڈرتے ڈرتے ہاتھ رکھا، وہ ایک قدم پیچھے ہوا اور میرا ہاتھ گرتے ہی پھر قریب آ کر اپنے غصے کو مشکل سے ضبط کرتے ہوئے بولا، اکبر جی، آپ کو کچھ پتہ بھی ہے کہ بندہ جب کوئی کام کرنے لگتا ہے تو اس کے بارے میں سوچتا ہے۔ذہن میں اس کا تصور بناتا ہے۔

پچھلے ایک گھنٹے سے میرے ذہن میں اس لڑکی،او لڑکی کہاں جی اس کی ماں کی آنکھ، اچھا چھوڑو دفع کرو۔۔۔۔۔ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میرے ذہن میں اس کا ایک

تصور ایک تصویر بن گئی تھی اس کے کپڑے بلکہ قمیض کا شلوار کا عکس، اس کی باڈی کا رنگ سائزاو باڈی سمجھتے ہیں ناں کہ یہ بھی نہیں پتہ ؟اس نے میری آنکھوں میں دیکھ کر میری جہالت پر ترس کھاتے ہوئے پوچھا،جی جی آپ بات جاری رکھیں۔۔۔۔۔۔ہاں، تو باڈی کا رنگ سائز، یہاں تک کہ آپ یقین کریں گے میرے ذہن میں ازار بند اور لاسٹک دونوں کی تصویر بن رہی تھی حالانکہ مجھے ابھی نہیں پتہ تھا کہ وہ کیا پہنتی ہے اور اس بندے کی ایک بات نے ساری تصویروں کو گندا کر دیا جیسے دودھ کے کڑاہ میں پیشاب کا قطرہ گر جائے جی یا جیسے شکر میں ریت مل جائے۔

کچھ باتیں کرنے کے بعد عمر حیات باہر سے ہی سلیم کو ہاتھ اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے اپنے گھر کی طرف نکل گیا اور میں خجل سی مسکراہٹ کے ساتھ واپس دکان میں آگیا۔

عمر حیات کے جانے کے بعد کریم کے لب و لہجے میں بھی یکدم تبدیلی آگئی تھی وہ کچھ دیر شاید ضبط کرتا رہا لیکن آخر وہ پھٹ پڑا۔۔۔اُس کا روئے سخن میری طرف لیکن اشارہ عرفی کی طرف تھا۔

یہ اج کل کی نئی نسل کو کیا ہو گیا ہے اکبر بھائی عزت، غیرت، حمیت کا تو کوئی احساس ہی نہیں ان کو، آپ خود ہی بتائیں بھلا کوئی بھی مرد اس طرح کی عورت سے شادی کرنے کا سوچ بھی سکتا ہے؟

عرفی کو شاید سب سے زیادہ غصہ اس بات پر تھا کہ پوری بات سنے بغیر ہی دونوں نے اس لڑکی کو "ایسی عورت" بنا دیا تھا۔ وہ غصے کو ضبط کرتے ہوئے بمشکل بولا۔

کیا یہ ضروری ہے کہ اُس نے اپنا سب کچھ اُس لڑکے کو سونپ ہی دیا ہو۔۔۔۔۔۔۔ کریم پھنکار کر بولا، دیکھ یار تونے اپنی اسی طرح کی سوچ سے ابھی ابھی میری ناک کٹوائی ہے، بس کر دو خدا کے لئے اب خاموش ہو جاؤ کیا عمر حیات صاحب شادی کر کے اُس سے پوچھنے بیٹھ جائیں گے کہ کیا کیا دیا تھااور کس حد تک گئی ہو بس اپنی چوکھٹ سے نکلی تو سمجھو گئی، ہمیشہ کے لئے۔

عرفی میری بازو اپنے کندھے سے نیچے جھٹک کر یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔۔۔ لیکن وہ لڑکا تو کہیں نہیں گیا۔ ہمیشہ کے لئے کیا، ایک دن کے لئے بھی نہیں۔

عرفی گھر چلا گیا، سب کی طبیعت مکدر ہو گئی تھی اس لئے کچھ دیر بعد میں بھی پھر آنے کا کہہ کر دکان سے چلا آیا۔ میرا اگلا چکر کوئی دس بارہ دن بعد لگا۔۔۔۔۔۔

واصف کی کوششوں سے کریم اور عرفی میں بھی راضی نامہ ہو چکا تھا اس لئے واصف اور عرفی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ کریم کی طبیعت میں ایک تبدیلی ایک تفاخر سا تھا اُس نے بات چیت شروع کی تو اس بات کی تصدیق بھی ہو گئی دیکھیں جی اکبر صاحب یہی باتیں یہی فیصلے ہوتے ہیں جو معاشرے کو بنا تے ہیں اور بنا کے رکھتے ہیں اور سماج کی قدروں اور اچھی باتوں کا رواج قائم رہتا ہے میں عمر حیات کی سوچ سے نہ صرف متفق ہوں بلکہ اُس کی قدر کرتا ہوں واصف نے اُس کی تائید میں سر ہلایا تو وہ مزید بولا یہ اس طرح کے غیرت مند مردوں کی ہی مہربانی ہے کہ معاشرہ ان خرافات سے پاک ہے۔ کریم کا کم عمر شاگرد اپنے کام میں منہمک ہونے کے باوجود زور زور سے اثبات میں گردن ہلا رہا تھا۔

اور دیکھیں خدا کو عمر حیات کا فیصلہ کتنا پسند آیا کہ اُس پاک ذات نے کچھ ہی دنوں کے اندر اُس کے لئے بہتر انتظام کر دیا کریم نے راحت آمیز تسلی سے نئی خبر سنائی۔ مجھے بہتر انتظام کی تفصیلات جاننے کا اشتیاق ہوا۔۔۔ ہم واصف کی منگوائی ہوئی چائے پی رہے تھے۔۔۔۔۔ میں کریم کا چہرہ حیرت بھری اور منتظر نظروں سے دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔۔۔ عرفی کچھ سوچ سوچ کر بے دھیانی میں بار بار ہاتھ کو مکا بنا رہا تھا کہ اچانک عمر حیات دکان میں داخل ہوا، اُس نے کریم اور واصف سے ہاتھ ملایا مجھے واجبی سا سلام کیا اور عرفی تو جیسے اُسے نظر ہی نہ آیا۔ کریم کو ، اُسے دیکھتے ہی، جیسے کچھ یاد آیا، اُس نے اُسی وقت فون پر کسی سے بات کی، شاید یہ فون اس نے اپنے گھر ہی کیا تھا ریسیور کریڈل پر رکھ کر وہ عمر حیات سے مخاطب ہوا۔

بیوی سے بات کی میں نے ابھی، الحمدللہ، پوری معلومات مل گئی ہیں۔ خاتون کنواری نہیں ہیں، عمر حیات کی بھنویں تن گئیں

۔۔۔۔ طلاق یافتہ ہیں لیکن پابند صوم صلوۃ ہیں،۔۔۔ کریم نے بات پوری کی، پھر ٹھیک ہے۔۔۔۔ عمر حیات نے برجستہ جواب دیا۔۔۔ پانچ برس قبل ہی شادی ہوئی تھی۔۔۔۔ خاوند شرابی کبابی نکلا۔۔۔۔ حکم ربی سمجھ کر برداشت کرتی رہیں، مار دھاڑ بھی کرتا تھا اور نشے کی حالت میں مخصوص امور کے فطری یا غیر فطری ہونے یا حرام حلال ہونے کا بھی خیال نہیں کرتا تھا۔۔۔۔ اب دیکھیں ناں جی انسان جانور تو نہیں ناں کہ ہر جگہ منہ مارے۔۔۔۔ لیکن ان باتوں پر بھی صبر کیا ۔۔۔ کریم کی بات سن کر عمر حیات کے چہرے سے نجانے کیوں مسرت ٹپکنے

لگی۔۔۔دیکھیں ناں جی اچھی اور خاندانی عورت مرنا پسند کرتی ہے لیکن طلاق کا کلنک تو نہیں لگنے دیتی ناں کریم نے میری طرف منہ کر کے فخریہ سے انداز میں کہا۔۔۔اُس کے شاگرد کی گردن تائید کی تسبیح پڑھنے لگی واصف میری رکی ہوئی گردن کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

اور شاید اللہ کو اُن کا یہی صبر پسند آ گیا کہ ایک دن اُس بدبخت شوہر نے نشے کی حالت میں یہ کہہ کر طلاق دے دی کہ تم بالکل لکیر کی فقیر ہو تمھاری اپنی کوئی شخصیت ہے ہی نہیں۔ کریم نے آخری بات کہہ کر جیسے خاوند کی بدقسمتی اور خاتون کی عظمت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

عمر حیات نے واصف کی طرف تائید طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، شرع میں کیا شرم جی۔۔۔۔۔۔ نکاح کیا تھا، خاوند نے اپنی بے راہ روی کی وجہ سے طلاق دے دی، دوسری شادی کر لو۔۔۔

کیوں جی اکبر صاحب، وہ اپنی قمیض کے دامن کے نیچے ہاتھ ڈال کر کھجلاتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔

جی جی شرع میں کیا شرم۔۔۔میں نے پر زور تائید کی۔

عرفی سر جھکائے، جلتی سگریٹ کے انگارے کو انگلی سے کرید رہا تھا۔

لو کا ایک جھونکا دکان میں داخل ہوا جس کے زور سے کالا دھاگہ دیوار کے ساتھ جا لگا اور باقی سب دھاگوں نے اس کو دبوچ لیا۔

بلورانی

جب میں نے پہلی بار اُسے دیکھا تو مجھے کراہت کے ساتھ ساتھ حیرت کا احساس ہوا۔ کراہت اِس لئے کہ وہ کم و بیش تیس بتیس برس کی ایک ایسی لڑکی یا عورت تھی جس کے بارے میں میں سُن چکا تھا کہ وہ بہت واہیات، گندی اور بد تمیز رنڈی ہے اور حیرت اس لئے کہ اُس کے جسم کے اکثر اعضاء ایک دوسرے سے مانو جیسے متصادم سے نظر آتے تھے۔ یہ اعضاء کے متصادم ہونے کی بات شاید آپ اپنے الفاظ میں خود کو بہتر سمجھا پاؤ اگر میں اپ کو فقط تفصیلات بتا دوں اور اس شے کو نام دینے کا فیصلہ آپ پہ چھوڑ دوں۔۔۔اُس کے ہاتھ خشک، کرخت، بھورے بالوں والے اور کہنیوں تک بازو بھی پٹھوں اور ہلکے ہلکے سے مردانہ کالے بالوں والے تھے لیکن شانے اور باقی جسم قدرے نازک اور بالوں سے پاک۔اسی طرح اُس کا اوپری جسم مردوں کی طرح تنا ہوا تھا اور سننے میں آتا تھا کہ وہ اکثر سامنے آنے والے کے شانے سے شانہ ٹکرا کر گزر جاتی تھی لیکن اُس کا سینہ کسی بھی عام عورت کی طرح نسوانی حسن کا حامل تھا۔۔اس کی آنکھیں کسی جنگلی بلی کی طرح تیز سنہری رنگ کی تھیں لیکن آواز بالکل ایک جنگلی بکرے کی طرح پھٹی ہوئی، سمع خراش اور بے ہودہ حد تک اونچی۔۔۔

حالانکہ مجھے دو ہی دن پہلے سامنے کی دکان والی خالہ ضمیراں نے بتایا تھا کہ 'پتر فیکے رانڑوں کبھی سامنے آجائے تو تھوک کے پرے ہو جانا، اُس کے منہ لگنا تو دور کی بات وہ جس راستے سے گزرے اُس رستے کو بھی چھوڑ کے گزرنا' لیکن اُسے پہلی نظر دیکھنے پر مجھے پتہ چلا تھا کہ سولہ سال کی عمر میں مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں ایک اٹھائیس تیس برس کی رنڈی کے سامنے آنے پر تھوکتا یا اس کو دھتکارتا۔ دوسرے وہ میری چھوٹی سی دکان پر ببل گم لینے آئی تھی اب میں اُسے کیا کہتا۔ ایک بچہ ٹافی لے کر جیسے ہی دکان سے باہر نکلا میں اُس کی طرف متوجہ ہوا، لیکن متوجہ ہونے اور بولنے کے بیچ کے ایک لمحے نے میرے اندر کے سر اٹھاتے مرد کو واپس ایک نو عمر لڑکا بنا دیا اور مجھے احساس ہی نہ ہوا کہ کیسے میرے منہ سے نکلا۔۔۔جی باجی، کیا چاہیئے۔۔۔اُس کا اپنے گریبان میں سے پیسے نکالتا ہوا ہاتھ ادھر ہی رک گیا، آنکھیں میرے چہرے پر گڑ گئیں اور ایک بے ہنگم، دل خراش سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔۔۔اوئے بچے۔۔۔ سوچ سمجھ کے بولا کر، تجھے پتہ ہے باجی کیا ہوتی ہے، اوئے تو نے مجھے باجی کہہ دیا ہے ؟۔۔۔ مجھے، بلو رانی کو ؟۔۔۔ تجھے پتہ بھی ہے میں کون ہوں ؟۔۔۔۔ میں کچھ نہ بول پایا۔۔۔پیسے میرے ہاتھ میں آئے میں نے پسینے کی نمی والے وہ سکے گلے میں رکھنے کی بجائے غیر محسوس طریقے سے ایک طرف رکھے اور اُسے دو ببل گم دے دیے، وہ اچھل کر دکان سے نکلی اور آگے بڑھ گئی۔

مجھے پہلی بار ذہن کا ماؤف ہونا اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جانا سمجھ میں آ رہا تھا، اس کے علاوہ اور کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، ماں باپ کی دوستوں عزیزوں کی

پڑوسیوں اور جاننے والوں کے برسوں کی باتیں، کتابوں کے جملے اور فلموں، ڈراموں کے مکالمے نجانے کہاں کہاں سے آ کر ذہن مین خلط ملط ہو رہے تھے۔۔۔ پھر میرا دھیان واپس رانی کے جسم کی طرف چلا گیا۔ ایسے لگتا تھا جیسے ایک عورت کے بنتے ہوئے وجود کے اندر سے کسی نے کلائیوں سے پکڑ کر ایک مرد کو باہر نکالنے کی کوشش کی تھی اور فقط کہنیوں تک بازو باہر نکال کر چھوڑ دیئے تھے یا جیسے کسی عورت کے وجود کے تھیلے کو کھول کر کسی نے ایک مرد اندر گھسیڑ دیا تھا جو کہیں کہیں سے اب بھی نظر آ رہا تھا۔۔ چہرہ قدرے کرخت تھا لیکن کہیں سے، کچھ تو ایسا تھا اُس کے لانبے سنہرے بال یا اوپر وی ہونٹ کے کنارے کا وہ تل جس سے اُس کے دور اندر چھپی کوئی خوبصورتی کوئی نزاکت باہر جھانک رہی تھی، آنکھیں سانپ سے بھی ڈراؤنی لیکن بار بار ایسے پلکوں کے پیچھے چھپنے والی، جیسے نیند میں ہوں۔

ماسی ضمیراں نے میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر مجھے خیالوں سے باہر نکالا۔۔۔ کن خوابوں میں کھو گیا ہے بچے؟۔۔۔

لے گئی چین سکون؟۔۔۔

ماسی ضمیراں کی کریانہ کی دکان میری دکان کے سامنے والے مکان کی دوسری طرف تھی لیکن گرمی میں دیوار کے سایے اور سردی میں دھوپ کئے لئے وہ اکثر میری دکان کی طرف ہی ٹوٹی ہوئی کرسی بچھا کر بیٹھا کرتی تھی، سایہ ملے نہ ملے میری دکان کے گاہک ضرور ہاتھ سے پکڑ کر زبردستی لے جایا کرتی تھی اور میں منہ دیکھتا رہ جاتا کبھی ماسی کا اور کبھی گاہکوں کا۔

ویسے بھی ماسی کی دکان پر محلے کے سب بڑے لڑکے سگریٹ لینے اور ادھر ہی بیٹھ کر پینے آتے تھے، میرے پاس ایک تو سگریٹ نہیں ہوتی تھی اور دوسرے دکان کے پیچھے بیٹھ کر سگریٹ پینے یا گپ لگانے کی جگہ تو بالکل بھی نہیں تھی۔۔۔

حاجی صاحب کا بیٹا ارشد پپو، آخری گلی کا لڑکا ناصر قذافی جیسے سب باوا قذافی کہتے تھے، کوٹھی والوں کا بیٹا نسیم لمبا، راشد فوجی، مجید مچھر، ندیم گنجا اور ایک دو دوسرے انجان سے لڑکے دوپہر کو اور رات دکان بند ہونے سے کچھ دیر پہلے آدھ گھنٹہ گھنٹہ ماسی کی دکان کے پیچھے بیٹھ کر سگریٹ پیتے اور سرگوشیوں میں گپیں لگاتے، ماسی محلے سے باہر کی خبریں اُن سے لیتی اور وہ سارے محلے کی باتیں ماسی سے پوچھتے۔

ماسی اچھی بھی تھی اور دکانداری بھی جانتی تھی، لڑکوں کو سگریٹ پلاتی، چائے کی ضرورت ہوتی تو وہ بھی ماسی کے گھر سے آجاتی جس کی دوگنی قیمت وصول کرتی اور کبھی کبھی تو کھانا بھی بیچتی لیکن کریانے کے سامان کے علاوہ سب چیزوں کے گاہک بس محلے کے بڑے بڑے لڑکے ہی ہوتے جو دکان کے پیچھے چھپڑ میں بچھی دو ٹوٹی ہوئی چار پائیوں پر بیٹھے رہتے اور ماسی کی بکری ہوتی رہتی۔

دیکھ چھوکرے یہ نالے والے محلے کی بہت خطرناک اور بدمعاش رنڈی ہے، ماسی نے ایک پاؤں میری دکان کے اندر رکھ کر باقاعدہ دھمکی دیتے ہوئے کہا۔ خبردار جو کبھی اُس سے کوئی فالتو بات کی یا اُس کے پیچھے گیا تو، میں تیرے ابے سے تیری

شکایت کر دوں گی، ہمارا شریفوں کا محلہ ہے، کبھی دیکھا ہے اپنے محلے کے کسی لڑکے یا مرد کو اس طرح کی گندی عورت سے بات کرتے بھی۔۔۔اسی لئے تو وہ ادھر سے گزرنے سے بھی کتراتی ہے کبھی غلطی سے ادھر کا رخ کر بھی لے تو دم دبا کر بھاگ رہی ہوتی ہے۔

میں ماسی کے سامنے تائید میں سر ہلاتا رہا لیکن میرا دل رانو کو دوبارہ دیکھنے اور اس کی باتیں سننے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔

اُس کے بعد ایک دو بار ہی سہی لیکن جب بھی رانی گلی سے گزری میں نے بے اختیار ماسی کی دوکان کی طرف دیکھا اگر تو وہ باہر کھڑی ہوتی تو میں کنکھیوں سے رانی کو دیکھتا اور اگر وہ اپنی دکان میں مصروف ہوتی تو میں باہر نکل کر رانی کو دور تک جاتا دیکھتا اور طرح طرح کے اندازے باندھتا۔ مثال کے طور پر، کیا اس کے ماں باپ کو پتہ ہو گا یہ یہ رنڈی ہے؟
کیا یہ شادی کرے گی؟ کرے گی تو اپنے خاوند کو کیا بتائے گی؟
اگر شادی کی اور بچے ہو گئے تو ان کو کیا بتائے گی؟
پھر میرا ذہن تھک جاتا اور میں دکان میں واپس آجاتا۔

شو کیس کے پیچھے پڑی میری کرسی سے باہر دیکھنے پر دکان کے چار فیٹ کے دروازے سے گلی کا تقریباً آٹھ دس فیٹ کا حصہ نظر آتا تھا۔ پہلے بولنے یا قدموں

کے چلنے کی آواز آتی پھر کچھ دیر بعد گزرتا ہوا راہ گیر اور اُس کے نظروں سے او جھل ہو جانے کے چند لمحے بعد تک اُس کی آواز آتی رہتی۔
ایک دن گلی سے رانی کی آواز آئی اُس نے ابھی ابھی دکان کے سامنے سے گزرنے والے سبزی فروش کو شاید کسی چھیڑ خانی پر گالی دی تھی اور ایسی گالی کہ ریڑھی کے چلنے کی آواز کچھ تیز ہو گئی تھی۔ ماسی ضمیراں باہر نہیں تھی، میں ٹکٹکی باندہ کر باہر گلی کی طرف دیکھنے لگا، اسی اثنا میں ڈلیوری والی وین آکر ماسی کی دکان پر رکی وہ جیسے انتظار میں تھی باہر نکلی تو اس دوران رانی بھی میری دکان کے سامنے پہنچ جانے پر اُس کی طرف متوجہ ہو کر اُس کے پاس کھڑی ہو گئی۔

ماسی نے بآواز بلند کہا، واہ مالک نیکی اور بدی ایک ساتھ ہی بھیج دی آج۔ رانی نے ماسی کو گالی دی اور پاس جا کر ہاتھ ملایا۔ ڈلیوری والے نے ٹافیوں چاکلیٹوں کے پیکٹ نکال کر ماسی کی طرف بڑھائے، ماسی نے ہنستے ہوئے رانی کی طرف اشارہ کر کے اُسے کہا او تیرے پاس بہت مال ہے اس کی دکان خالی ہے کچھ مال اس دکان میں بھی ڈال دے۔ وہ ہنسنے لگا تو رانی نے خونخوار نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، کام کر اور نکل، چل شاباش چل۔
وہ تو بھاگ گیا لیکن ماسی دکان کے اندر جا کر بھی چپ نہ ہوئی، دکان کے اندر محلے کے لڑکے بیٹھے تھے ماسی نے دکان میں داخل ہو کر دوبارہ آواز لگائی، چھوٹی سی وین کے مال سے اس کی دکان نہیں بھرتی اس کو ٹرک کا مال چاہیئے تم ہی کچھ کرو، لڑکوں نے ایک قہقہ لگایا میں سوچ رہا تھا اب رانی کی گالیوں کی آواز آئے گی لیکن وہ دکان سے ایسے باہر نکلی جیسے کسی نے دھکا دیا ہو اور اپنی راہ پر چل پڑی۔ اُسے جاتا

دیکھ کر نجانے کیوں میرے دل میں ایک عجیب سا ملال پیدا ہوا۔ میرا دماغ اس خیال کو حقارت سے نوچنے کی کوشش کرتا رہا لیکن دماغ کی پہنچ سے دور دل کے اندر کہیں یہ عجیب سا خیال ایک ننھے سے پودے کی طرح سر اٹھا رہا تھا کہ میں رانی کو اٹھا کے اپنی سویٹر کے اندر ڈال لوں نہ کوئی اُس کو تنگ کرے اور نہ وہ گلیوں میں گھومے۔

پتہ نہیں کیوں مجھے ہمیشہ ایسا لگتا جیسے ماسی ضمیراں اور رانی کی لڑائی حاجی صاحب کی دونوں بیویوں کے بیچ ہونے والی لڑائی جیسی ہوتی تھی کہیں نہ کہیں ضرور کوئی ایسی بات تھی جو مجھے کچھ ایسا احساس دلاتی کہ ماسی ضمیراں رانی سے مقابلہ کرتی ہے خاص طور سے جب رانی کے ماسی کی دکان سے جانے کے بعد وہ اپنی دکان ہر بیٹھے لڑکوں کو طعنے دیتی کہ وہ کیوں رانو کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے یا جب رانو کو کوستی کہ کیوں ان کے سامنے اپنے ٹشن دکھاتی ہو اور اس کی بھدی آواز کی نقل اتار اتار کر لڑکوں کے سامنے اسے شرمندہ کرتی تو ایسا لگتا جیسے ماسی ان سب لڑکوں کی پہلی بیوی اور رانو اس کی سوتن ہو۔

رانی کے جانے کے بعد ماسی کی دکان پر مکمل خاموشی چھا گئی اور کچھ ہی دیر میں چرس کی بو آنے لگی۔

میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ لڑکوں نے دکان کے پیچھے اب نشہ پانی بھی شروع کر دیا تھا کبھی صبح سویرے گلی کی صفائی کے لئے آنے والا جمعدار دیسی شراب کی کپیاں

اٹھاتے ہوئے ماسی سے شکوے کر رہا ہوتا کہ دیکھو لوگ کیسے اپنی جان کے خود دشمن بنے ہوئے ہیں اور کبھی رات گئے چوکیدار چرس کی بو پا کر ادھر ادھر ٹٹول رہا ہوتا کہ کون جاگ رہا ہے۔۔۔

جو گلی ماسی کی دکان کے سامنے سے شروع ہو کر دور تک جاتی تھی اُس کے آخر میں ایک بد معاش رہتا تھا لطیف، لطیف کمانی میکر وہ نشہ بھی کرتا تھا اور محلے میں خبر تھی کہ اُس نے دو تین بار لوگوں کو چھری یا چاقو بھی مارا ہوا ہے۔ مجھے اُس کی باتوں کی آواز آئی تو میں جلدی سے دکان سے باہر نکلا۔ میری ہمیشہ یہ خواہش ہوتی کہ وہ میرے سامنے کسی کو مارے اور میں دیکھوں کی چھری کیسے مارتے ہیں اور اس کے بعد بندہ کیا کرتا ہے۔۔۔ لیکن وہ تو آج ماسی ضمیراں کو کچھ کہہ رہا تھا

او دیکھ مائی، تو عورت ذات ہے ہماری ماں کی جگہ ہے اس لئے میں تیری عزت کرتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ محلے میں ہماری ناک کے نیچے سب کچھ ہوتا رہے اور ہم آنکھیں بند کر لیں

لیکن ماسی نے اُسے اس سے آگے ایک لفظ نہ بولنے دیا اور منہ اور سینے پر ہاتھ مار مار کے اتنے زور زور سے دھاڑیں مارنے لگی کہ

پورا محلہ اکھٹا ہونے لگا، لطیف کمانی میکر کمانی کی طرح جھک کر وہاں سے کھسک گیا اور میں اپنی دکان میں آ کر دبک گیا۔

دن ایسے ہی معمول کے مطابق گزر رہے تھے کہ اچانک جیسے محلے میں طاعون کی وباء پھوٹ پڑی ہو گلیاں سنسان ماسی کی دکان ویران اور بڑے بچے سب گھروں میں بند....

میں شدت سے اس تبدیلی کو محسوس کر رہا تھا لیکن کوئی خبر نہ تھی کہ ایسا کیا ہوا ہے۔ ایک دن صبح میں نے دکان کھولی تو جیسے ایک دھماکے کی آواز سنی ۔۔۔۔۔ بات تھی ہی ایسی پتہ نہیں چاروں پانچوں لڑکوں میں سے کس کی حرکت تھی لیکن ماسی کی پندرہ سالہ پوتی حاملہ ہو چکی تھی ماسی جیسے سکتے میں چلی گئی تھی دکان کھولتی بیٹھتی اور گلی میں پڑے کسی کنکر، کسی چھلکے یا بدرو سے باہر چھلکے ہوئے گندے پانی کو دیکھتی رہتی خبر پھیلنے کے بعد پہلا دن گزرا دوسرا دن گیا تیسرا دن آ گیا نہ کوئی ماسی کی دکان پر گیا نہ کسی نے اس سے بات کی اور نہ وہ کسی سے کچھ کہتی لیکن میری دکان کے باہر سے جب نمازی گزرتے تو ان کے نظر آنے سے چند لمحے پہلے اور بعد میں مجھے سرگوشیاں سنائی دیتیں۔۔

اچھا ہوا ایسی کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔۔

نہیں برا ہوا لیکن بندہ الزام کس کو دے۔۔۔

چار پانچ لڑکے تھے جی۔۔۔

جی جی بندہ ہاتھ دھرے تو کس پر دھرے

حاجی صاحب کا لڑکا۔۔

ارے چھوڑو جی حاجی صاحب زکواۃ کمیٹی کے بانی مبانی ہیں ہوش کے ناخن لو۔

تو کیا کوٹھی والوں کا بیٹا۔۔۔

ارے کیا بک رہے ہو بھیا پتہ ہے ملک صاحب نے اپنے خرچے پر یہ ساری گلی پکی کروائی تھی، ورنہ پہلے یہاں بارش ہو جائے تو تین تین دن پانی کھڑا رہتا تھا اور بو ہی نہیں جاتی تھی۔

تیسرے دن شام کو رانو گلی سے گزری.... کیوں اوئے شریف بچے، باجی کے بھیا، تیری ماسی کی دکان پر تو ہمارا داخلہ بند ہے، سالی حرافہ !!! طعنے دیتی ہے، کیا تو ایک کھلا سگریٹ دے گا یا تو بھی۔۔۔۔۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔
ایک عورت کو اپنے لئے یوں سگریٹ مانگتا دیکھ کر میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔....

ماسی بیمار ہے، میرے منہ سے شاید حیرت چھپانے کی کوشش میں بے اختیار نکلا، ہائیں، کیا کہا بیمار ہے، اس رنڈی کو کیا ہو گیا، لیکن تجھے بھلا کیا پتہ ہو گا، چل ٹھیر جا میں خود پتہ کرتی ہوں گالیاں تو دے گی پر ہے تو حرامزاد دکھیاری، خاوند بھی حرامی چھوڑ گیا بیٹا بھی چو تیا نکلا اب اس کا اور کون ہے.. رانو یہ کہتی ہوئی ایسے بے دھڑک ماسی کی دکان کی طرف بڑھی جیسے وہ اس کی اپنی دکان ہو۔۔۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد جب رانی ماسی ضمیراں کی دکان سے باہر نکلی تو مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے اس کے جسم پر غور کر کے حیرت کیوں ہوتی تھی وہ چنگاڑ رہی تھی اس کی آواز گلی کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک گونج رہی تھی، اوئے مرد تو ہوتے ہی خصی یا بوسیے ہیں، کیا تم عورتوں کو بھی تین دن سے ننگی پڑی ایک عورت پر کوئی کپڑا ڈالنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی؟ اوئے تم عورتیں ہو کر کیسے اسے اس طرح

چھوڑ سکتی ہو، چند کھڑکیوں کے دروازے لوہے کی میلی، گرد سے اٹی جالیوں اور اندھے شیشوں کے پیچھے سے چرچرائے اور پھر مضبوطی سے بند ہو گئے، رانی زخمی درندے کی طرح گلی کے چوک میں بدکنے لگی، میں بتاتی ہوں تمھیں ان سب سفید پوشوں کے کرتوت، سب میرے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہیں، کہو تو سب کے اندر کے حلیئے اور سائز تک بتادوں... پھر رانی ماسی کی طرف مڑی جو آج تیسرے دن دکان سے باہر نکل آئی تھی، ماسی ایسے مودب انداز میں جھکی ہوئی تھی جیسے کوئی بچہ پڑوس کی لڑائی میں اپنی کھڑپینچ ماں کو بلا کر باقی بچوں کو ڈانٹ پلواتے ہوئے بظاہر مسکین بن جاتا ہے۔۔۔سات دن، سات دن کے لئے جا رہی تھی میں آج پتہ نہیں کتنے سالوں کے بعد اپنے شہر، رانو بازو بلند کر کے چلائی، لیکن اب صرف تین دن، یہ رانڑوں کا تجھ سے وعدہ ہے، تین دن بعد میں واپس آؤں گی اور اگر تیرے ساتھ انصاف نہ ہوا تو میں دلاوں گی تجھے انصاف، میں ابھی جاتے ہوئے جھاڑیوں والے میدان سے ہی گزروں گی، جہاں نشہ پانی چلتا ہے، اور وہ حرام کے جنے اگر وہاں ملے تو میں ان کو بتا کے جاؤں گی، نہیں تو انھیں بتا دینا کہ بس تین دن ہیں ان کے پاس، یا تو اپنا کام سنبھالیں یا پولیس کو اپنی ماں کا یار بنانے کے لیے تیار رہیں۔۔

یہ جس میدان کا ذکر رانی کرتے کرتے گئی تھی وہ محلے کے باہر سوڈیڑھ سو کنال کا حکومت کی ملکیت ایک قطعۂ اراضی تھا جس میں ایک طرف کرکٹ کا گراونڈ تھا، ایک طرف گندے پانی کا جوہڑ اور بیچ میں کچھ جھاڑ جھنگار جس کے بیچوں بیچ گھاس

پر نشئی لوگ اندھیرا ہوتے ہی بیٹھ جاتے، دو تین گلیوں کا راستہ میدان میں سے ہو کر گزرتا لیکن ارد گرد گھر دور ہونے روشنی کا کوئی انتظام نہ ہونے اور گھاس پھونس ہونے کی وجہ سے جو کوئی بھی بیٹھا ہو اور چاہے جو مرضی کر رہا ہو پاس سے گزرنے والے کو کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔۔
اگلی صبح محلے میں سرسراہٹ ہونے لگی، پہلے کچھ عورتیں ماسی کی دکان پر آئیں اور پھر ماسی کو محلے کی ایک بیٹھک میں لے جایا گیا، میں دکان کھلی چھوڑ کر بیٹھک کی کھڑکی کے ساتھ کان لگا کر دھوپ سینکنے کے بہانے کھڑا ہو گیا۔

ملک صاحب بولے، دیکھ ضمیراں جو ہو گیا اب وہ واپس نہیں ہو سکتا، اگر تجھے کوئی رشتہ ملتا ہے تو شادی کے اخراجات میں اٹھانے کو تیار ہوں، لیکن خبردار اس سے یہ نہ سمجھنے لگنا کہ قصور میرے بیٹے کا ہے اس لئے میں ایسا کر رہا ہوں، حاجی صاحب بولے، نہیں جی ملک صاحب وہ تو بات ہی الگ ہے کون ہے جو کسی پر کچھ ثابت کر سکے یہ تو بلوے والا حساب ہے کسی کا بھی نام نہیں لیا جا سکتا اور سب کو تھوڑا تھوڑا قصوروار کہا جا سکتا ہے، لیکن اگر ضمیراں عزت سے معاملہ نمٹانہ چاہے تو لڑکے کا بھی مسئلہ نہیں میرے گوداموں پر ایک یتیم لڑکا کام کرتا ہے اپنے ہی ہاتھوں کا پلا ہے میرے حکم پر انشاءاللہ دوسری نہیں کہے گا ۔

جرگے کے بعد پورا دن سرگوشیاں ہوتی رہیں اور شام میں ماسی ضمیراں نے یہ کہ کر بات ختم کر دی کہ رانڑوں آئے گی تو بات کر کہ فیصلہ بتا دوں گی۔ .

سر گوشیاں آوازوں میں بدل گئیں، مرد کیا عورتیں بھی دوبارہ گھروں سے باہر نکل آئیں لیکن اب ہر سننے والے کان اور کہنے والی زبان کے درمیان موضوع ہی کچھ اور تھا،

عشأ کے بعد میری دکان کے سامنے سے ایک آواز اندر آئی

یہ ماسی ضمیراں کس قدر واہیات عورت ہے محلے کے بڑوں نے کتنا بڑا فیصلہ کیا، اس لاوارث کی جس کا باپ نشہ کرتا ہے عزت رکھنے کہ کوشش کی اور یہ ہے کہ ایک رنڈی ایک بد چلن عورت کو اپنا وکیل بنانے پر تلی ہوئی ہے۔

دوسری آواز زیادہ فکرمند تھی،

او جی وہ پیشہ ور عورت سال بھر نہ آئے تو کیا ماسی پورا سال اُس کا انتظار کرتی رہے گی اور بچہ جنوا کر ہی دم لے گی۔

صبح میری دکان پر صابن لیتے ہوئے ایک عورت نے اپنے منہ پر میری طرف ہاتھ رکھ کر دوسری کو سرگوشی میں کہا۔۔۔

میں تو کہتی ہوں کہیں یہ سب رانڑوں کا ہی کیا دھرا نہ ہو ماسی کو نیچا دکھانے کے لئے۔

دھوپ میں بیٹھے ہوئے میاں جی نے پاس بیٹھ کر اخبار سناتے استاد جی کو کہا۔۔

بھائی صاحب میں تو کہتا ہوں قیامت کے آثار یہی ہیں اور بھلا کیا۔

استاد جی اخبار سے نظریں ہٹا کر میاں جی کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے لمبی سانس چھوڑ کر بولے۔۔۔
اب ایک رنڈی محلے کی عزت کا فیصلہ کرے گی۔ .

دن کب رکتے ہیں۔ آج رانی کو گئے تیسرا دن تھا، آج اس نے آنے کا کہا تھا، ماسی بے چین تھی، عورتیں سرگوشیاں کر رہی تھیں اور مردوں کی اکثریت کا خیال تھا کہ ایک بازاری عورت کی زبان کا کیا اعتبار اس وقت جذبات میں بڑا بول بول گئی اب تو اسے یاد بھی نہیں ہوگا کہ کیا بڑھک مار کے آئی تھی...

رات گزر گئی اور رانی واقعی نہ آئی۔

دوسرے دن شام کو ماسی ضمیراں دکان پر آنے والے گاہکوں کو اپنی پوتی کی دعا خیر کی مٹھائی کھلا رہی تھی کہ تھَوک کا سامان دینے والی گاڑی آئی، ڈرائیور نے ماسی کی دی مٹھائی کھاتے ہوئے دو تین بار کانوں کو ہاتھ لگا کر استغفار کی، ماسی تنک کر بولی اوبے عقلا خوشی کی مٹھائی ہے کانوں کو ہاتھ کیوں لگاتا ہے، او نہیں ماسی کچھ نہیں خود بیٹی والا ہوں لڑکی ذات کے نصیبوں سے ڈر گیا ادھر محلے سے باہر میدان میں پولیس کو ایک لاوارث عورت کی لاش ملی ہے کچھ ظالموں نے پہلے اس کی عزت خراب کی پھر پتہ نہیں کس ڈر سے دانتوں سے اس کی زبان چبا ڈالی اور پھر بھی ظلم سے من نہیں بھرا تو اسی کے دوپٹے سے اس کا گلا گھونٹ دیا۔

جلاتنک

اپنے ہی بیٹے پر۔۔۔۔ خالی کمرے میں رسی سے بندھے، بلوری آنکھوں والے اپنے ہی جوان بیٹے پر پستول تانے، نیم پاگل حالت میں کھڑا، چھ فٹ کا مرد، ملک ریاض، قابل رحم لگ رہا تھا۔ وہ کبھی سر کا نشانہ لیتا، کبھی سینے کا اور کبھی اپنے ہی بیٹے کے دل کا۔ اُس کے جسم پر کپکپی طاری تھی، ٹانگیں بری طرح لرز رہی تھیں اور ناک سے پانی بہہ رہا تھا۔ اُس نے اپنے کانپتے ہونٹوں کو بھینچا، آنسوؤں سے لبریز اپنی آنکھیں زور سے بند کیں اور پستول کی لبلبی پر رکھی اپنی دونوں انگلیوں پر دباؤ بڑھانا شروع کر دیا۔

پچھلے کچھ دنوں سے ٹوانہ اب روز ہی اُسے ملنے لگا تھا، مکانوں کی پشت جڑی ہونے کے باوجود پہلے تو مہینے دس دن میں ایک آدھ بار ہی مڈ بھیڑ ہوتی تھی، مگر اب تو آتے جاتے، سڑک پر چڑھتے ہی، مسجد سے نکلتے ہی کوئی نہ کوئی ایسا اتفاق ہو جاتا کہ ٹوانہ یا مولوی سعود اُس سے مل جاتے۔

ملک اُس سرخ گیٹ والے کا کچھ کرنا پڑے گا ٹوانے نے جینز کی پینٹ کے پاکٹوں سے ہاتھ نکال کر ملک کے شانے پر بازو رکھتے ہوئے بات شروع کی۔۔۔۔۔اور میں جانتا ہوں کہ تم ہی کچھ کر سکتے ہو، کبڈی کے پرانے کھلاڑی ہو، لڑنا جانتے ہو اور مجھے پتہ ہے کہ دشمن کے حاوی ہونے سے پہلے اُس کا زور توڑنے کی اہمیت سے

واقف ہو۔۔۔ بس میں..... بلکہ میں ہی کیا پوری سکیم دیکھ رہی ہے کہ کب تم اُن لوگوں کو یہ مکان خالی کرنے پر مجبور کرتے ہو، سالے حرام زادے چاروں باپ بیٹے ایک سے بڑھ کر ایک اپنے آپ کو بدمعاش اور بہت بڑے تیس مار خان سمجھتے ہیں۔ ٹوانہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔ تمھیں پتہ ہے اِن باپ بیٹوں کی نظر تمھارے ساتھ والے پلاٹ پر ہے انھوں نے اتھارٹی آفس کے اندر کچھ لوگوں سے ساز باز کر کے پلاٹ اپنے نام کرانے کی کوشش شروع کر دی ہے، ٹوانے کی بات ختم ہوتے ہی مولودی سعود نے سر پر رکھے رومال کو درست کرتے ہوئے ملک کو مطلع کیا۔ اچھا اچھا جبھی تو میں بھی کہوں کہ گھر کے سب لوگ پلاٹ میں چہل قدمی کے بہانے آ کر دیر تک بنچوں پر کیوں بیٹھے رہتے ہیں، اِس کا مطلب ہے مستقبل کے منصوبے بن رہے ہیں، ملک نے جیسے خالی جگہ اپنے شکوک سے پُر کر دی۔۔۔۔ ملک جی اگر پلاٹ انھیں مل گیا تو محلے کا جینا تو دو بھر ہو گا ہی ہو گا لیکن آپکی تو دیوار کے ساتھ دیوار جڑی ہو گی آپکا کیا ہو گا۔ مولوی سعود نے ایک اور پتہ پھینکا۔

ملک کے دو ہی کام تھے زیادہ وقت گھر پر گزارنا اور باہر نکلنا تو اپنی بند گلی اور سکیم میں اپنی فوقیت اور اہمیت کے بارے میں گلی محلے کے لوگوں کی باتوں کی ٹوہ وغیرہ لیتے رہنا۔

ملک جب گھر پر ہوتا تو زیادہ وقت اپنی اٹھے ہوئے کولہوؤں اور پھولے ہوئے سینے والی بیوی کو دیکھ دیکھ کر یا پکڑ کر خوش ہوتا رہتا، اس کی بیوی ملک کی بے

جا پابندیوں کی وجہ سے بس دو ہی حالتوں رہتی یا تو لیٹنے کے لئے تیار یا پھر ملک کے پاس آنے سے بالکل بے زار، اکثر جب وہ تیار ہوتی تو ملک کی سائیکل کے کتے فیل ہو جاتے اور وہ گھر سے باہر نکل جاتا لیکن جب وہ بے زار ہوتی تو ملک کو اُسے زبردستی پکڑنے میں ایک عجیب سامزا آتا، جیسے اُسے شکار کرتے ہوئے آیا کرتا تھا۔

گھر کے معاملات میں وہ ملک کی لمبی دلیلوں اور بستر پر طاقتور بازوؤں کے سامنے اکثر بے بس ہو جاتی، دل میں گالیاں دیتی اور اگلے روز پھر پہلے جیسی ہو جاتی۔

ملک اب اپنے گھر میں بیوی اور دونوں بیٹوں کے سامنے بھی سرخ گیٹ والے نئے لوگوں کے بارے میں فکر مندی کے انداز میں ذکر کرنے لگا تھا۔ اُس کا بڑا بیٹا اِن باتوں پر زیادہ کان نہ دھرتا اور اکثر ملک کو کہتا، ابا جی ایسا کچھ لگتا تو نہیں، اُن انکل اور بھائی جان لوگوں کو میں نے ایک دو بار دیکھا ہے مجھ سے تو بڑے اچھے طریقے سے ملے ہیں... الو کے پٹھے تجھے کتنی بار سمجھایا ہے اُن سے نہ ملا کر کبھی آمنا سامنا ہو بھی جائے تو کنی کترا جاتا ہے بندہ اور یہ جو تُو رات دیر تک گلی کی نکڑ پر لڑکوں کے ساتھ کھڑا رہتا ہے ناں، کسی دن ٹانگیں توڑ دوں گا میں تمھاری۔ بیوی سرخ گیٹ والوں کے بارے میں ملک کا تفکر دیکھتی، باتیں سنتی اور ساری عقل مندی اور مستقبل بینی کا اظہار ایک ہی جملے میں کر دیتی، ملک جی آپ خود ہی دیکھ لیں آپ بہتر ہی سمجھتے ہوں گے۔۔۔ اور چھوٹا بیٹا تو تھا ہی چھوٹا اپنے کھیل کود میں مگن نہ اس سے کوئی بات کرتا نہ پوچھتا۔

ملک رات کو بستر پر دراز ہوتا تو اُس کے دماغ میں ٹوانے اور مولوی سعود کی باتیں گونجنے لگتیں۔ سکیم کی اِس بند گلی کا سارا ماحول خراب ہو جائے گا، سب کچھ ہاتھ سے نکل جائے گا، گلی کے سب لوگ ملک صاحب، ملک صاحب کہہ کر بلاتے ہیں اِن نئے بد بختوں کی وجہ سے ایک ٹکے کی عزت نہیں رہے گی اور ویسے بھی یہ اُس کمی کمین صدیقی کے ہم خیال لگتے ہیں جو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا، سب سے پہلے آیا تھا اِس گلی میں میرے ساتھ ہی اور آج تک مجھے نیچا دِکھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر صدیقی اور یہ نئے لوگ ایک ہو گئے تو میرا کیا بنے گا۔اِن کی عورتیں کتنی آزاد اور بے باک ہیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ کون کس کی بیوی اور کس کی بہن ہے سب ہی ایک دوسرے کے ساتھ کھلے عام گھومنے پھرنے نکلے ہوتے ہیں۔ان کے یہاں رہنے کا مطلب ہے ہم لوگ بھی اپنی عورتوں اور بچوں کی تابعداری سے ہاتھ دھو لیں، کچھ تو کرنا ہی پڑے گا اِن بے غیرتوں کا۔

جمعہ کی نماز کے بعد ٹوانہ اور مولوی سعود ملک کے ساتھ ہی چلتے چلتے اُس کے گھر کے کونے تک آئے۔ یہ ہماری مسجد کا امام کچھ بدلتا نہیں جا رہا، اِس کے خطبوں میں وہ جوش وہ گرمی نہیں ہے بس نماز پڑھاتا ہے اور دو چار سیدھی سیدھی باتیں کر کے فارغ کر دیتا ہے، جمعہ کے خطبے میں ایک ولولہ ہونا چاہیے کچھ ایسا کہ لوگوں کو پورا ہفتہ یاد رہے۔ مولوی سعود کسمساتے ہوئے بولا۔۔۔بس ایک بار میں اپنی مسجد بنوا لوں تو پھر دیکھنا میں کیسا خطبہ دیتا ہوں۔۔۔۔۔ چھوڑیے ناں مولوی صاحب، ٹوانے نے سعود کی بات کاٹی وہ جانے اور اُس کا کام، ہمیں کیا لینا دینا۔۔۔ہاں تو

ملک میں کہہ رہا تھا کہ وقت گزرتا جارہاہے اور تم کچھ بھی نہیں کررہے ہو کہیں بہت دیر نہ ہو جائے۔۔۔یار ٹوانہ صاحب میرے بچے ابھی چھوٹے ہیں اور شریف لڑکے ہیں جبکہ اُس کے تینوں لڑکے جوان ہیں، میں سوچتا ہوں کہیں اُن میں سے کوئی میرے بچوں کو نقصان نہ پہنچادے دیوار کے ساتھ خالی پلاٹ ہے اور وہ بھی درختوں سے ڈھکا ہوا رات کو دیوار پھلانگ کر گھر میں کچھ پھینک ہی جائیں تو میں تو گیا نا۔

اچھا یہ بات ہے،لو جی ملک جی پھر کیا یاد رکھو گے آپ بھی،اب کے مجھے گاؤں کا چکر لگانے دو، آپ کے لئے ایسا تحفہ لاؤں گا کہ یاد ہی رکھو گے، مولوی سعود نے مژدہ سنایا۔

عشاء کی نماز کے بعد ملک مسجد سے واپس آتے ہوئے اپنے گھر میں داخل ہونے کی بجائے پلاٹ کی طرف چل پڑا، درختوں کے اندھیرے میں کچھ کھسر پھسر ہو رہی تھی ملک نے تھوڑا آگے ہو کر آنکھیں پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی، اچانک ایک کتا زور سے بھونکا اور ملک کی طرف شاید لپکنے کی کوشش کی، دو ادھیڑ عمر میاں بیوی اور ایک نوجوان بینچ پر بیٹھے باتوں میں مشغول تھے نوجوان نے لپک کر لمبے لمبے بالوں والے چھوٹے سے رَسکی ٹوائے کتے کا خوبصورت سا پٹہ پکڑ کر اُسے ڈانٹ دیا۔۔۔نو، ٹونی، نو، نو۔۔۔بیڈ بوائے۔۔۔ملک اچھل کر واپس گلی میں ہو گیا، اُس کا دل دھک دھک کر رہا تھا، اُسے شرمندگی سی محسوس ہوئی جو چند ہی لمحوں میں شدید غصے میں تبدیل ہو گئی، وہ گالیاں بکتا ہوا اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔

مولوی سعود اپنے علاقے سے ملک کے لئے کتوں کا ایک جوڑا لے کر آیا، بڑے بڑے منہ، طاقتور جبڑوں اور بے رحم آنکھوں والے لڑاکا کتے۔ کتوں کی زنجیریں ہاتھوں میں پکڑتے ہی جیسے ملک کی طاقت اور جنون کئی گنا بڑھ گیا۔ ایڑی کے زور پر کتوں کو کھینچ کر روکتے ہوئے ملک مولوی سعود سے بولا، یہ کام کیا ناں آپ نے مولوی صاحب اب مزا آئے گا، اب میں پلاٹ میں بیٹھا کروں گا رات گئے تک اور دیکھوں گا کون ادھر میٹنگیں کرتا ہے میری دیوار کے ساتھ۔

اب ملک صبح اٹھ کر کتوں کو نہلاتا، گلی میں بلکہ سڑک پر گھمانے لے کر جاتا اور پھر سہ پہر کو پلاٹ میں درختوں کے نیچے باندھ کر پاس ہی کرسی بچھا کر بیٹھ جاتا، کبھی ان کے جسم پر کنگھے کر کے پسو نکالے جا رہے ہیں تو کبھی ان کے کٹے ہوئے کانوں کو تھوڑا اور کٹوا کر انھیں مزید لڑاکا بنانے کا پروگرام بن رہا ہے، کبھی ان کے لئے پٹے آرہے ہیں تو کبھی گوشت۔ ملک، ٹوانے اور مولوی سعود نے اپنے اپنے ذرائع سے کتوں کو لڑاکا اور خونخوار بنانے کے کچھ نادر اور آزمودہ طریقے بھی دریافت کر لئے، اب ملک کتوں کو ہر وقت باندھ کر رکھتا یا تو گھر کے اندر سیڑھی کے نیچے یا پھر پلاٹ میں کونے والے درخت کے ساتھ اِس سے کتوں کے اندر ایک وحشت پیدا ہوتی ہے، کتوں کے ساتھ بہت سختی سے پیش آیا جاتا، اس سے کتوں میں کاٹنے کی خواہش تیز ہوتی ہے، کتوں کی خوراک دیر سے اور دور رکھ کر دی جاتی، اس سے زور اور بربریت پیدا ہوتی ہے، اکثر کتوں کی آنکھیں باندھ دی جاتیں اس سے کتا ہر ایک پر بھونکنا سیکھتا ہے۔

ملک کا زیادہ وقت اب کتوں کے ساتھ اور اُن کی ٹریننگ میں ہی گزرتا وہ سوتے جاگتے اپنے کتوں کو خونخوار تر ہوتا دیکھتا اور تصور ہی تصور میں اپنے کتوں سے سرخ گیٹ والوں کی کتیا اور ٹانگوں کو نوچوا تا رہتا۔

ملک کے بیٹے کے امتحان سر پر تھے باپ کو تو اِس بار تیاری کرانے کا کچھ ہوش نہ تھا اِس لئے لڑکا خود ہی کبھی اپنے ہم جماعتوں کو گھر پر بلا لیتا اور کبھی خود کسی دوست کے ہاں چلا جاتا اور رات دیر سے ہی لوٹتا۔ ایک رات ملک اپنے بیٹے کے دوستوں کے گھروں میں جب اُس کا پتہ کرنے گیا تو کتوں کو بھی ساتھ ہی لے گیا، سکیم سے ایک سڑک ہائی وے کے نیچے سے ہوتی ہوئی اُس پار کی آبادی تک جاتی تھی رات کے سناٹے میں دو طاقتور اور خونخوار کتوں کی زنجیریں پکڑ کر سڑک کے بیچوں بیچ چلتے ہوئے ملک کو عجیب سا لطف آ رہا تھا اکا دکا راہگیر انھیں دیکھ کر دور سے سے سڑک کے دوسرے کنارے پر ہو جاتے اور ملک پہلے سے بھی زیادہ کھل کر چلنے لگتا، چھوٹے سے انڈر پاس میں داخل ہوتے ہی انھیں ایک کتا نظر آیا، ملک کے کتوں نے غراتے ہوئے زنجیروں کو کھینچنا شروع کر دیا، سامنے والا کتا شاید بیمار یا زخمی تھا پل بھر میں ملک کے دونوں کتے ملک کو گھسیٹتے ہوئے اُس پر ٹوٹ پڑے جتنی دیر میں ملک زنجیروں کو کھینچ کر کتوں کو روکتا اتنی دیر میں وہ اُس مریل سے کتے کو لہولہان کر چکے تھے، ملک کے کتوں کی خونخوار غراہٹ اور مریل کتے کے چیخنے چلانے کی گونج نے انڈر پاس میں اتنا ہیبت ناک تاثر پیدا کیا کہ ایک لمحے کے

لئے ملک کانپ کر رہ گیا اُس نے کتوں کو گالیاں بکنی شروع کر دیں اور تیز تیز دوسری طرف نکل گیا۔

اگلے آٹھ دس دن ملک کتوں سے پہلے والی دلچسپی نہ رکھ سکا، کتے سیڑھی کے نیچے یا پلاٹ میں کونے والے درخت کے ساتھ ہی بندھے رہتے، سرخ گیٹ والوں کی بھی کوئی خیر خبر نہ تھی ایسے لگتا تھا جیسے پلاٹ تو دور اپنا مکان ہی چھوڑ کر چلے گئے ہوں ملک کتوں کے پاس جاتا بھی تو چمکار کے، ایک دو گالیاں دے کر واپس اندر چلا آتا، بڑا بیٹا تو رات بھر دوستوں کے ہاں امتحانات کی تیاری کرتا اور صبح دیر سے اٹھتا، چھوٹا ہی تھا جو کتوں کو کچھ کھانے پینے کو ڈال دیتا لیکن وہ بھی جیسے ملک کی طرح بے سدھ سے ہوتے جا رہے تھے، سوئے سوئے اور کھانے سے بیزار۔

ملک کی نظریں جمعہ کی نماز کے دوران اگلی پچھلی صفوں میں مولوی سعود اور ٹوانے کو ڈھونڈتی رہیں مسجد سے نکلتے ہوئے اُس نے ایک جاننے والے سے دونوں کے بارے میں استفسار کیا۔۔۔ارے کیا ملک صاحب؟ آپ کے تو قریبی دوست ہیں دونوں اور آپ کو ہی پتہ نہیں۔۔۔دونوں میں آج کل کچھ ان بن چل رہی ہے ،ادھر آگے گلی میں، شاید آپ کے گھر کی طرف ہی کوئی پلاٹ ہے، سعود نے وہاں مسجد بنوانے کے لئے نصف قیمت پر پلاٹ خریدنے کی زبان بندی کی ہوئی تھی اور ٹوانے نے اُسی پلاٹ کو پوری قیمت پر خریدنے کے لئے بیانہ دے دیا ہے، کہتا ہے ایک طرف بڑی گلی ہے اور ایک طرف سڑک، ایک طرف گھر بناؤں گا اور ایک طرف دکانیں۔ بس اسی بات پر دونوں میں ٹھن گئی۔۔۔ملک پاؤں پٹخ کر زیر

لب موٹی موٹی گالیاں دیتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر کے دروازے پر پڑوس کی ایک عورت کھڑی ملک کی بیوی سے کچھ باتیں کر رہی تھی، ملک کو دیکھتے ہی وہ اپنے گھر کی طرف چل پڑی،

کیا ہوا، کیا کہہ رہی تھی یہ عورت کیا، کیا پھر بچوں کی کوئی شکایت ہے یہ لوگ میرے بچوں کو ہنستا کھیلتا کیوں نہیں دیکھ سکتے۔۔۔

نہیں ایسی کوئی بات نہیں، سرخ گیٹ والوں کا بتا رہی تھی۔۔۔

ملک کے کان ایک دم کھڑے ہو گئے، اُس کا دھیان فوراً اپنے کتوں کی طرف گیا۔

کہہ رہی تھی کہ اُن لوگوں کے بیٹے نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے، کافی دنوں سے گھر میں کچھ اختلافات چل رہے تھے، بہو اپنے ساس سسر کے ساتھ رہنے پر راضی نہ تھی اُن کے بیٹے نے پہلے تو اپنی بیوی کو سمجھایا بجھایا پھر یہ ہمارے ساتھ والا پلاٹ لینے کی کوشش بھی کی کہ چلو یہاں ہی ایک مکان بنا کر ماں باپ کے پاس ہی اپنا گھر بسا لے گا لیکن جب پلاٹ میں ہمارا اٹھنا بیٹھا اور کتے باندھنا دیکھا اور کسی نے اُسے بتایا کہ پلاٹ ہم نے لے لیا ہے تو بات بنتے بنتے بگڑ گئی اور آخر کار طلاق ہو گئی۔

ملک کے ذہن میں ٹوانے اور سعود کی باتیں اور مشورے گونجنے لگے، کڑی سے کڑی ملنے لگی، ملک دروازے کو لات مار کر بند کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا، دیکھ لوں گا اِس ٹوانے اور مولوی کو بھی، دیکھتا ہوں اِس پلاٹ میں کون آتا ہے۔ وہ بہت

غصے میں تھا۔ چھوٹا بیٹا اپنے کمرے میں ہی دبک گیا، بیوی ملک کو رام کرنے کے لئے، بچ بچا کے، اُس کے سامنے مختلف زاویوں میں آنے جانے لگی لیکن بے سود، شام تک ملک نے کئی بار دونوں سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن دونوں کے فون مسلسل بند جارہے تھے۔

رات کا پچھلا پہر تھا، ملک کا بڑا بیٹا دوستوں کے ہاں سے پڑھائی سے فارغ ہو کر گھر آیا تو اُسے کال بیل بجانے کی ہمت نہ ہوئی، ابا آج بہت غصے میں ہیں اگر اُن کی آنکھ کھل گئی تو خیر نہیں۔۔۔وہ کچھ دیر چھوٹے بھائی کے کمرے کی کھڑکی کو کنکر اُٹھا اُٹھا کر مارتا رہا اور آخر کار گیٹ پھلانگ کر گھر میں داخل ہو گیا۔ سیڑھیوں کے نیچے سے عجیب سی آوازیں آرہی تھیں، کتے ایسے غرا رہے تھے جیسے کسی پر نہیں بلکہ خود پر ہی بگڑ رہے ہو۔ ملک کا بڑا بیٹا کتوں کے پاس چلا گیا، اُس نے ایک کتے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے، سرگوشی کی کیا ہوا آج ابا نے غصے میں تمھیں بھی نہیں پوچھا، اچانک کتا اُس پر جھپٹا اور اُس کے ہاتھ پر کاٹ لیا۔۔۔زخم معمولی تھا، لڑکا خوف اور درد سے اچھل کر پیچھے ہوا اور کتوں کو گالیاں دیتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

آج سکولوں میں سالانہ امتحانات کے نتائج کا دِن تھا، ملک کے بیٹوں کا بھی نتیجہ نکلنا تھا، لیکن ملک کے گھر میں جیسے صف ماتم بچھی ہوئی تھی اڑوس پڑوس کا تانتا بندھا ہوا تھا، ملک اپنی سب طاقت سب پیسا لگا چکا تھا لیکن ڈاکٹر تین دِن پہلے اپنی مایوسی کا اظہار کر چکے تھے، ملک کے بڑے لڑکے کو باؤلا کتا کاٹے سے جلا تنک کا روگ

لگ چکا تھا علاج کی کوششیں اپنی جگہ لیکن اب بہت دیر ہو گئی تھی، مرض تمام اعصابی نظام کو مفلوج کر کے دماغ پر اثر انداز ہونا شروع ہو گیا تھا۔

اپنے ہی بیٹے پر۔۔۔۔۔ تنہا کمرے میں، رسی سے بندھے بلوری آنکھوں والے اپنے ہی جوان بیٹے پر پستول تانے، نیم پاگل حالت میں کھڑا، چھ فٹ کا مرد، ملک ریاض، قابل رحم لگ رہا تھا۔ کبھی وہ سر کا نشانہ لیتا، کبھی سینے کا اور کبھی اپنے ہی بیٹے کے دل کا۔ اُس کے جسم پر کپکپی طاری تھی، ٹانگیں بری طرح لرز رہی تھیں اور منہ اور ناک سے پانی بہہ رہا تھا۔ اُس نے اپنے کانپتے ہونٹوں کو بھینچا، آنسوؤں سے لبریز اپنی آنکھیں زور سے بند کیں اور پستول کی لبلبی پر رکھی اپنی دونوں انگلیوں پر دباؤ بڑھانا شروع کر دیا۔

ہارمون

ٹی وی پر نیوز چینل کا ایک مخنث سا رپورٹر ایک رنگ برنگی دھاریوں والے پھڑ پھڑاتے ہوئے پرچم کے نیچے کھڑے ہجوم کے
پس منظر کے ساتھ خبر دے رہا تھا۔۔۔ ناظرین آج کا دن تاریخی اہمیت کا حامل دن ہے، جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ آج عالمی تہذیب و ثقافت کے مرکز اس شہر میں ہم جنسوں کی شادی کا قانون پاس ہونے کے بعد، لوگ جوش و جذبے سے بے قابو ہو کر سڑکوں پر جمع ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔۔ ناظرین ہم آپ کو بتاتے چلیں کہ ہم جنس پرستی کوئی نفسیاتی بیماری، کوئی جسمانی عارضہ، کوئی گناہ یا کوئی جرم بھی نہیں ہے، اور اب تو یہ آپ کا قانونی حق ہے۔۔۔ یہ تو ہارمونز کا فیصلہ ہے مجھے کہنے دیں کہ یہ آپکا پیدائشی حق ہے۔ اپنی زندگی جیئیں، گھٹ گھٹ کر اپنے آپ کو مار کر نہ جیئیں۔۔۔۔۔

اُس نے صوفے میں دھنسے دھنسے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کروٹ بدلی اور میوٹ کا بٹن دباتے ہوئے ریموٹ ایک طرف پھینک کر، سر صوفے کی پشت پر ٹکا کر، چھت پر لگے مکڑی کے جالے لپٹے پنکھے کو گھورنے لگا، جو اس پرانی عمارت کے اس درمیانے درجے کے اپارٹمنٹ میں ایئر کنڈیشنر کے لگنے کے بعد بہت سالوں

سے بے مقصد لٹک رہا تھا۔۔۔ جیسے اُس کے ماضی کے چند برس بھی مکڑی کے جالے کی طرح کہیں لپٹے رہ گئے تھے۔۔۔

اُس کے گھورتے گھورتے پنکھا ریل گاڑی کے پہیے کی طرح دھیرے دھیرے گردش کرنے لگا اور اُس کی خرر خرر کی آواز سے کمرے کا منظر پندرہ سولہ برس پہلے وہاں سے ہزاروں میل دور کے ایک مضافاتی علاقے کے چھوٹے سے گھر کے کمرے میں تبدیل ہو گیا۔

سکول سے گھر آتے ہوئے اُس کے ذہن میں استاد جی کی باتیں دوبارہ گونجنے لگیں تھیں، گدھے، نالائق، صرف تین صفحے دیئے تھے اور وہ بھی یاد نہیں ہوئے تجھ سے ،استاد جی تین تو صرف آپ نے دیئے تھے ریاضی کی پوری مشق اور قاری صاحب نے پوری سورہ یاسین زبانی۔۔۔۔۔۔ ،چپ ناہنجار تُو ہے ہی سُست، یا تو تیرے دماغ میں بھوسا بھرا ہوا ہے یا پھر تُو ہڈ حرام ہو گیا ہے اور اسے استعمال ہی نہین کرتا،

اور جو فضول کام ہیں وہ تو تُو بہت خوب کر لیتا ہے۔۔۔ ڈرائینگیں کر کے رنگ ایسے بھرے گا جیسے بہت بڑا پینٹر ہے، اپنا نام ایسے ایسے انداز سے لکھے گا جیسے صادقین اسی کا باپ تھا،،،استاد جی نے آخری جملہ لڑکوں کی طرف منہ کر کے ہنستے ہوئے کہا ۔۔۔ جس پر پورا کلاس روم صادقین سے ناواقفیت کے باوجود قہقہوں سے گونج اُٹھا تھا، چل ہاتھ نکال۔۔۔ اور استاد جی نے سولہ بید گن کر اُس کے ہاتھوں پر برسائے، مار کھاتے ہی وہ ہمیشہ کی طرح لیٹرین کی طرف بھاگا تھا، پتہ نہیں کیوں جب اُسے کوئی چوٹ لگتی تھی یا وہ پریشان ہوتا تو اُس کے پیٹ میں ایک مروڑ سا اُٹھتا تھا اور

اُسے بے بس ہو کر فوراً رفع حاجت کے لئے جانا پڑتا، کچی لیٹرین میں فضلے کے ڈھیر اور اس پر بھنبھناتی سینکڑوں مکھیوں کو گھورنے اور دیواروں سے باتیں کر کر کے رونے کے بعد جب وہ واپس آیا تو پورا پیریڈ اپنے ہاتھ بغلوں میں دبائے عجیب و غریب بے تکی باتیں سوچتا رہا تھا۔۔۔گھر کی طرف جاتے ہوئے اس بات کو تین چار گھنٹے گزر چکے تھے اُسے ہاتھوں پر بید لگنے کا درد کم ہو گیا تھا لیکن اُس کے دل و دماغ پر اُس وقت سے وہی عجیب سی کیفیت چھائی ہوئی تھی جو اکثر ایسے مواقع پر اُسے گھیر لیتی تھی۔۔۔اُس کے سر کے اندر جیسے پیلی پیلی سی دھند بھری ہوئی ہو اور دل و دماغ میں پیدا ہونے والا ہر خیال، ہر سوال ہر غصہ اور انتقام اُس دھند کے اندر کسی کثیف سی دلدل میں دھنستا جاتا ہو۔

گھر میں داخل ہوتے ہی روزانہ کی طرح ماں نے آگے بڑھ کر اُس سے بستہ تھام لیا، وہ کپڑے بدل کے آیا تو چٹائی پر کھانا چنا ہوا تھا پنکھے کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے نیچے بیٹھ کر اُس نے کھانا شروع کیا تو ماں پاس بیٹھ کر کبھی اُس کے شانے اور کبھی گھٹنے پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگی، ماں پاس ہوتی تو وہ دھند اور دلدل پتہ نہیں کہاں غائب ہو جاتی تھی شاید اس کا اپنا جسم ہی اُسے جذب کر لیتا تھا یا شاید وہ دھواں بن کر ہوا میں اُڑ جاتی تھی۔

کھانا کھا کر وہ وہیں پنکھے کے نیچے چٹائی پر لیٹ گیا، وہ اکثر اُلٹا لیٹتا تھا۔ ابا ابھی گھر نہیں آئے تھے اس لئے اُس کی ماں برتن رسوئی میں رکھ کر واپس آ کر اُس کے پاس بیٹھ کر اُس سے سکول کی باتیں سننے کے ساتھ ساتھ شام کے کھانے کے لئے چاول

صاف کرنے لگی وہ تھوڑی دیر بعد اُس کی کمر پر ہاتھ پھیرتی یا کوئی بات سمجھاتے ہوئے پیٹھ پر پیار سے چپت لگا کر مل دیتی۔۔۔ماں جب پیٹھ پر ہاتھ پھیرتی تو اُسے بہت اچھا لگتا تھا وہ نیند میں ڈوبنے سے پہلے سوچ رہا تھا ابا ایسا کیوں نہیں کرتے انھوں نے تو کبھی مجھے دلاسہ بھی نہیں دیا۔۔۔

نجانے کب اُس کی آنکھ لگ گئی تھی۔۔۔۔اچانک کسی برتن کے گرنے کے شور سے اُس کی نیند ٹوٹ گئی، اُس کا منہ تکیے میں چھپا ہوا اور آنکھیں بند تھیں لیکن کانوں کو ابا کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ابا تھکے ہارے کام سے گھر واپس آئے تھے اور کسی بات پر غصے میں آکر پانی کا گلاس اماں کے دے مارا تھا اور اب کہہ رہے تھے، خود تو جاہل ہو ہی اسے بھی تباہ کر رہی ہو یہ تمھارے پیار کا ہی نتیجہ ہے، اس پر سختی کیوں نہیں کرتی ہو، کبھی سوچا ہے کہ اس کا اٹھنا بیٹھنا اور سونا جاگنا ابھی تک بچوں جیسا کیوں ہے، ساتویں میں پڑھتا ہے اور لگتا ہے ابھی تیسری جماعت کا بچہ ہے سو یا دیکھو کیسے ہے جیسے کوئی ہیجڑا ادائیں دکھا رہا ہو، کچھ پیدائشی زنخے ہوتے ہیں یہ اپنی عادتوں سے بنے گا۔۔۔۔

ابھی بچہ ہی تو ہے، اور آپ اسے گھر سے باہر گلی محلے کے بچوں کے ساتھ بھی تو زیادہ کھیلنے پھرنے نہیں دیتے کہ ان جیسا جاہل نہ ہو جائے نہ اُسے خود باہر جاتے ہوئے ساتھ ساتھ رکھتے ہیں پھر کیسے تیز طرار ہوتا، اس عمر میں لڑکے بالے قابو میں ہی نہیں آتے اور میرا بیٹا تو ماشاء اللہ لاکھوں میں ایک ہے، بڑا ہو گا تو دیکھنا کیسا سمجھدار اور کیسا گبرو جوان بنے گا میرا بیٹا۔

ماں نے حسب دستور پلو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے اُس کی وکالت کر دی تھی۔۔

بڑا ہو گا تو کون سا تیر مارے گا، یہ مرد کے بچوں کی دنیا ہے اور خاص کر ہمارا علاقہ ۔۔۔۔ پتہ ہے کیسا کیسا نشئی، جواری اور خناس رہتا ہے یہاں پر لیکن ایک بار میں اپنی شیر والی نظر سے آنکھ میں آنکھ ڈال کے دیکھوں تو مجال ہے جو کوئی دوبارہ نظر اٹھائے۔ لڑکوں کو دلیر اور جی دار ہونا چاہیئے، لڑکیوں کی طرح بھولا بھالا اور معصوم نہیں۔

وہ کانپتے دل کے ساتھ کافی دیر وہیں ساکت پڑا رہا تھا اُس کی آنکھوں کے سامنے اپنے کلاس روم کا منظر گھومنے لگا تھا وہ ڈیسک کے اوپر ناچ رہا ہے اور سب لڑکے تالیاں بجا بجا کر ہنس رہے ہیں کچھ دیر بعد وہ چٹائی سے ایسے اٹھا جیسے اُس نے کچھ سنا ہی نہ ہو اور لیٹرین میں گھس گیا تھا، لیٹرین اُس کے لئے جیسے ایک جائے پناہ تھی، جیسے وہ اُس کا گھر بلکہ اُس کا بھیتر اُس کا من تھا، یہاں وہ خود سے باتیں کرتا، دیر تک روتا، جھاڑو سے تنکے توڑ توڑ کر پاؤں کے ناخن میں گھسیڑتا اور زمین پر لکیریں لگاتا رہتا، لیٹرین میں اُسے کوئی آواز نہیں دیتا تھا، کوئی غصہ نہیں کرتا تھا، کوئی اُس کے جسم اُس کی حرکات و سکنات کا جائزہ نہیں لیتا تھا۔۔۔ اگر کوئی بات ہوتی بھی تو کم از کم اتنی دیر رک جاتی تھی جتنی دیر وہ لیٹرین میں پناہ لیے ہوتا۔ وہاں سے نکل کر برآمدے میں پڑا بستہ سائیکل کے پیچھے رکھتا ہوا وہ سیدھا ٹیوشن کے لئے نکل گیا۔

اماں اچھی تھی لیکن ابا سے ڈرتی تھی، روتی تھی۔

اُس کا دل چاہتا تھا کوئی ایسا ہو جو ماسٹر جی کی طرح بہت پڑھا لکھا ہو، اور ابا کی طرح بہت غصے والا اور بہادر ہو، لیکن وہ اُس کا دوست ہو وہ اس کی جگہ استاد جی سے بات کرے، ابا سے لڑے۔۔ پیلی دھند نے پھر اُسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

سائیکل چلاتے ہوئے وہ بار بار اپنے ذہن میں اپنے وجود، اپنے اٹھنے بیٹھنے کے انداز اور اپنے چہرے کا تصور کرنے لگا تھا کبھی اُسے اپنا آپ ایک سخت مزاج لمبے تڑنگے لڑکے کے روپ میں نظر آتا اور کبھی ایک شرماتے لجاتے سہمے ہوئے ہیجڑا نما بچے کا جو بار بار اپنی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر اپنی قمیض درست کر رہا ہوتا۔

ٹیوشن والے ماسٹر جی کے پاس بیٹھا ہوا وہ سوچنے لگا کاش ٹیوشن کا ٹائم کبھی ختم نہ ہو یا پھر اس کے بعد کہیں اور جانا پڑا کرے، اُسے کاموں کے ختم ہونے سے نفرت سی ہو گئی تھی کیوں کہ ہر کام کے ختم ہونے پر گھر جانا پڑتا تھا اور گھر جانے سے اُسے وحشت ہوتی تھی، ہاں جب ابا کام کے سلسلے میں دو تین دن کے لئے شہر سے باہر ہوتے تھے تو وہ گھر میں بہت خوش رہتا تھا۔

جب وہ ٹیوشن سے گھر کی طرف نکلا تو اُس کے سر سے ساری دھند غائب ہو چکی تھی، کہیں سے شام کی ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا تو اُسے سائیکل چلانا بہت اچھا لگا اُس نے منہ ہوا کی طرف کر کے ایک دو لمحوں کے لئے آنکھیں بند کیں اور ایسے محسوس کرنے لگا تھا جیسے ہوا میں اُڑ رہا ہو لیکن ہوش اس وقت آیا جب اُس کا منہ زمین پر جا لگا، وہ ایک لڑکے سے ٹکرا گیا تھا لڑکے نے اٹھتے ہی اُسے دو تھپڑ لگائے اور اُس کا گریبان مروڑ کر پکڑ لیا، کیوں اوئے ممی ڈیڈی سائیکل کی گدی لے کے

سونے کا بہت شوق ہے، میرے ساتھ سوئے گا؟ پہلی بار تھوڑا بہت اچھلے گا لیکن پھر خود بھاگا بھاگا آیا کرے گا۔۔۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

جب وہ گھر پہنچا تو ابا برآمدے سے گزر رہے تھے، اس کے منہ پر لگی دھول مٹی دیکھ کر طنزیہ انداز میں ہنسے اور کمرے میں چلے گئے اُسے لگا وہ اُس کے نہیں بلکہ اُس لڑکے کے ابا تھے جس نے اُسے مارا تھا۔۔۔ وہ دھند میں لپٹا لیٹرین میں داخل ہو گیا تھا۔

وہ طرح طرح کے خواب دیکھا کرتا تھا، اُڑنے والی مشین بنانے کے، بہت سے غبارے خرید کر اُن سے شمعیں باندھ کر رات کو چھوڑ دینے کے، بہت سے دوست بنا کر اُن کے ساتھ بہت دور دور گھومنے جانے کے، اُسے ڈرائنگ اور خطاطی کرنے کا بھی شوق تھا وہ ایک ہی نام۔۔۔ عام طور پر اپنے نام کو ہی مختلف انداز میں لکھا کرتا اور اکثر پھولوں اور پتوں کی تصویریں بناتا رہتا تھا۔ اُسے کبھی کبھی خود پر غصہ بھی آتا کہ ابا اُسے ایک سخت سا مرد بنتا دیکھنا چاہتے تھے لیکن وہ ہر وقت کھیل کود اور خوشی و مزے کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔

ایک دن اس نے فیصلہ کیا کہ وہ محلے کے لڑکوں میں اٹھے بیٹھے گا اور بالکل ایسا بنے گا جیسا کہ ابا چاہتے تھے، اب وہ سکول یا ٹیوشن آتے جاتے اور آدھی چھٹی کے وقت سکول کے احاطے میں مختلف لڑکوں کے چلنے، اٹھنے بیٹھنے اور بات کرنے کے انداز یا آواز کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیتا رہتا، کسی کی آواز اُسے بھاری اور مردانہ لگتی تو وہ اُس کی طرح بولنے کی کوشش کرتا، کوئی ٹانگیں کھول کر پائنچے اُٹھا کر بازو پھیلا کر کسی

فلم کے ولن کی طرح بیٹھتا تو وہ کن اکھیوں سے اُس کو دیکھتا رہتا اور پھر اُسی طرح بیٹھنے کی کوشش کرتا لیکن اتنی دیر میں اُسے یاد آتا کہ وہ بھاری آواز میں بولنا تو بھول ہی گیا ہے اور اُس نے اپنے من میں ابھی خود سے جو بات کی تھی وہ تو اپنی اصل آواز میں ہی کر دی تھی۔۔۔اچانک سکول کی گھنٹی بجتی اور وہ ہڑبڑا کلاس روم کی طرف بھاگتا اور وہاں پہنچ کر اُسے یاد آتا کہ وہ تو اُس انداز میں چل کر آیا ہی نہیں جس کا اُس نے ارادہ کیا تھا اور یہ کیا وہ تو پھر اُسی طرح بیٹھا ہے جیسے وہ روزانہ بیٹھا کرتا تھا حالانکہ ابھی ابھی تو اُس نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بازو پھیلا کر، ٹانگیں کھول کر اور پائنچے اُٹھا کر بیٹھے گا۔ بعض اوقات وہ سوچتے سوچتے چونک کر استاد جی کی طرف دیکھتا تو وہ اُسے حیرت سے گھور رہے ہوتے تھے۔

ایک دن اُسے سکول کے میدان میں ایک لڑکا نظر آیا تھا جو ایک ہاتھ پیٹ کے برابر ہوا میں لٹکا کر کمر کو خفیف سا بل دے کر چل رہا تھا وہ اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا تھا اُس لڑکے کی کمر دوسرے لڑکوں سے پتلی تھی اور اُس میں لچک بھی زیادہ تھی، ہاتھ سفید سفید اور نازک سے تھے اور انگلیاں لمبی اور پتلی، اُس نے آگے جا کر غور سے اُس کے چہرے کا جائزہ لیا لیکن چہرہ بالکل عام لڑکوں جیسا تھا وہ بے چین ہو کر تیز تیز قدموں سے واپس سکول کے اندر چلا گیا اور لیٹرین میں جا کر قمیض اٹھا کر اپنی کمر کو ہلا ہلا کر دیکھنے لگا تھا کبھی اُس کو اپنی کمر پتلی لگتی تھی کبھی موٹی اور کبھی بالکل ٹھیک، اُس نے اپنے ہاتھوں اور انگلیوں کا جائزہ لیا اور تھوڑی دیر کے لئے قدرے مطمئن سا ہو کر کلاس روم کی طرف چلا گیا تھا۔

ان دنوں اُس کی جماعت کے لڑکے چھٹی کے بعد کچھ دیر سکول کے سامنے ہی میدان میں کرکٹ کھیلا کرتے تھے ایک دن وہ بھی وہاں رک گیا اور اپنے ایک ہم جماعت کے ساتھ کھیل میں شامل ہو گیا پہلے بیٹنگ دوسری ٹیم کے حصے میں آئی اور اُسے سلپ پر کھڑا کیا گیا گیند تیزی سے آئی وہ ابھی ہاتھوں کا پیالہ بنا کر جھک ہی رہا تھا کہ گیند اُس کی ٹانگوں سے نکل کر باونڈری پر جا پہنچی تھی ایک دو لڑکوں نے اووووہ ہہہہ کی آواز بلند کی اُسے پسینہ آ گیا اور وہ اگلی بار کے لئے مزید چوکنا ہو گیا تھا۔۔۔۔ کچھ دیر بعد گیند اُس کے دائیں گھٹنے کے پاس سے گولی کی طرح گزری وہ فقط ہلکی سی جنبش کھا کر خالی ہاتھ ہوا میں اُٹھا کر رہ گیا تھا، اس نے محسوس کیا کہ آنکھوں سے منظر دیکھنے اور ہاتھوں سے رد عمل ظاہر کرنے کے درمیان اُسے بہت دیر لگتی تھی جبکہ باقی لڑکوں کے ہاتھ پاؤں جیسے خود بخود فوری رد عمل ظاہر کرتے تھے۔۔ میرے اندر کوئی خرابی ہے۔۔۔۔ اُسے سوچ میں پڑا دیکھ کر، سب لڑکے اُس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے، اُس کے ساتھ کھڑا لڑکا بولا، بیٹا تو بٹیرے پکڑا کر گیند پکڑنا تیرے بس کا کام نہیں ہے، بس آج سے تیرا نام بٹیرا ہو گیا، سب لڑکے ہنسنے لگے تھے، وہ دو چار قدم پیچھے سرک گیا تا کہ باقی لڑکوں کو اُس کے آنسو نظر نہ ائیں۔۔۔۔ کچھ دیر میں فیلڈ میں تبدیلی کر کے اُسے دور دیوار کے پاس کھڑا کر دیا گیا تھا تا کہ دور سے سب کو دیکھ دیکھ کر وہ کھیل کو تھوڑا سمجھ بھی لے۔۔۔ اچانک ایک لڑکے نے زور دار شاٹ لگائی گیند ہوا میں بہت اوپر تک بلند ہوئی اور۔۔۔ بد قسمتی سے گیند سیدھی اُسی کی طرف آ رہی تھی گیند کے گرنے سے پہلے کے چند ثانیوں میں وہ بار بار اپنے تصور میں اپنی سخت سے مزاج والے لمبے تڑنگے لڑکے والی

تصویر کو لاتا لیکن اگلے ہی لمحے اُس کے ابا کی آواز اُس کے کانوں میں گونجتی اور ایک معصوم سا ڈرا سہا ہوا مخنث سا لڑکا اُس کے انکھوں کے سامنے آ جاتا۔۔۔ گیند اُس کے ہاتھوں کو چھو کر زمین پر گری اور تیزی سے دوسری طرف نکل گئی تھی وہ گھبرا کر اُس کے پیچھے بھاگا وہ پہلے بھی یہی محسوس کیا کرتا تھا لیکن اُس دن اُسے یقین ہو گیا کہ گھٹنوں سے اوپر اُس کا جسم بھاری اور عورتوں کی طرح الٹی صراحی جیسا ہے اور گھٹنے ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں وہ تیزی سے نہیں بھاگ پا رہا تھا۔۔۔ گیند کے ساتھ ساتھ وہ بھی میدان سے باہر نکلا اور بستہ اُٹھا کر ایک طرف چل پڑا تھا اُسے بہت دکھ ہو رہا تھا کہ اُس نے کرکٹ کھیلنے کی خواہش کیوں کی اور کیوں فضول سے جسم اور فضول سی شخصیت والا ہو کے دوسرے اچھے اچھے لڑکوں جیسا بننے چلا تھا۔

وہ پیلی پیلی دھند میں لپٹا ہوا گھر کی طرف چل پڑا تھا۔

ایک دن سکول سے آتے ہوئے اس نے اپنے ایک نئے دوست جو اُسے بہت اچھا لگتا تھا سے دبے دبے انداز میں کہا تھا میں کچھ دیر تم سے تھوڑا آگے چلتا ہوں تم غور سے دیکھ کر بتانا میں کیسے چلتا اور کیسا لگتا ہوں۔ دوست کو اسکی بات کی جیسے سمجھ نہ آئی، وہ ہنسنے لگا تھا ارے یار کیا کہہ رہا ہے کیا دیکھوں، کیا مجھے پیچھے سے اپنی پیٹھ دکھا رہا ہے، وہ جھینپ گیا تھا۔ لیکن بات بنانے کے لئے اُس نے جواب دیا نہیں یار میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ میں ابھی تک لڑکا ہی ہوں یا مرد بن گیا ہوں، اُس کا دوست ہنس ہنس کر دوہرا ہو گیا اور وہ گلی میں ارد گرد دیکھنے لگا تھا کہ کہیں کوئی اور تو انھیں نہیں دیکھ رہا، کچھ دیر بعد دوست نے رازدارانہ انداز میں اُس کے کان میں کہا، اگر اس

بات کا پتہ لگانا ہے تو تجھے ایک طریقہ بتاتا ہوں، پتہ بھی چل جائے گا اور تجھے اتنا مزا آئے گا کہ مجھے دعائیں بھی دے گا۔

نسخہ سن کر پہلے تو اُسے ڈر لگا تھا لیکن پھر لڑکے کے مذاق اُڑانے پر وہ بہت حیران ہوا کہ اتنا آسان طریقہ اور وہ بھی بالکل مفت اُسے خود کیوں پتہ نہ تھا، اُسے خود پر غصہ آنے لگا تھا کہ شاید ابا ٹھیک ہی کہتے تھے اگر میری عادات بھی مردوں جیسی ہوتیں تو میرا دھیان خود بخود اس طریقے کی طرف جاتا، اُسی سہ پہر ٹیوشن جانے سے پہلے جب نہاتے ہوئے اس نے اپنے نئے دوست کے بتائے ہوئے طریقے سے خود کو سہلانا شروع کیا تو اس کی سسکاری نکل گئی تھی اُسے لگا تھا جیسے وہ سائیکل پر ہے، اور ہوا میں اڑا جا رہا ہے، اس نے جسم کے مزے سے زیادہ اس احساس کے مزے کی شدت سے آنکھیں بند کر لیں کہ وہ مرد ہے۔۔۔ اچانک بہت قریب سے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی، اس نے آنکھیں کھولیں تو خوف سے لرز گیا تھا، ابا غسل خانے کے پردے کے ساتھ سے گزر کر لیٹرین کی طرف جا رہے تھے۔ سارا مزا خوف اور شرمندگی میں بدل گیا تھا، اُس نے جلدی جلدی ہاتھوں سے صابن کا جھاگ صاف کیا، کپڑے پہنے اور ٹیوشن چلا گیا تھا۔

اب اس کا دل ہر روز، ہر وقت نہانے کو چاہتا تھا، لیکن غسل خانے کی طرف دیکھتے ہی وہ اپنا ارادہ بدل دیتا۔

ایک دن ٹیوشن والے ماسٹر جی نے اُس سے اکثر کھویا کھویا اور اداس رہنے کی وجہ پوچھی تھی تو اُس نے انھیں دھند اور دلدل کے بارے میں بتایا تھا، وہ اُس کو اِس تکلیف سے نجات کا طریقہ بتانے کا وعدہ کرتے ہوئے اس کے سر اور کمر پر ہاتھ

پھیرنے لگے، اُسے بہت سکون ملا تھا جیسے اُس دن ماں نہیں بلکہ ابا نے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرا ہو۔ ماسٹر جی نے دوسرے دن سب بچوں کے جانے کے بعد اُسے پاس بٹھایا اور اس کی ہتھیلی غور سے دیکھتے ہوئے بولے تھے، ہوں، تمھاری چوری تو پکڑی گئی۔۔۔ وہ سہم گیا تھا۔ لیکن ماسٹر جی میں نے تو صرف ایک بار۔۔۔ ماسٹر جی نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا، ڈرو نہیں یہ تو سب مرد کرتے ہیں، ہم بھی کرتے ہیں۔۔۔ لیکن تمہاری بات اور ہے، کیوں ماسٹر جی میری بات اور کیوں ہے کیا میں مرد نہیں ہوں۔۔۔ ماسٹر جی ہنس پڑے تھے، ابھی تم چھوٹے ہو اگر تم اکیلے میں کرو گے تو بہت نقصان ہو سکتا ہے اس لئے ہم تمہاری مدد کریں گے۔

اس کا دل ڈر رہا تھا، وہ جانتا تھا کہ کچھ بہت غلط ہو رہا ہے، لیکن چاہتے ہوئے بھی وہ کچھ نہ بول سکا۔ اذیت ڈر سے زیادہ تھی اور ویسے بھی کسی بھی بات پر نہ کرتے ہوئے اور خاص طور پر اپنے سے بڑے کسی مرد کے سامنے نہ کرتے ہوئے اُس کی زبان بند ہو جاتی تھی اور ٹانگیں کانپنے لگتیں تھیں۔۔۔ اور پھر جب ماسٹر جی اُسے خود اسی طریقہ سے سکون دینے لگے جیسے اُس کے دوست نے بتایا تھا تو اُس کا ڈر قدرے کم ہو گیا تھا، ماسٹر جی اسے سینے سے لگاتے، اس کے ہونٹ اور گال چومتے اور اس کی گردن پر انگلیاں پھیرتے تو وہ آنکھیں موند لیتا۔

ان چند راتوں کو وہ اپنی چارپائی پر ٹانگیں کھول کر بازو پھیلا کر سیدھا سویا تھا۔

کچھ دن بعد ماسٹر جی نے اُسے ایک نئے طریقے کے بارے میں بتایا جو اُسے بالکل بھی اچھا نہ لگا تھا لیکن وہ اب انھیں کسی قیمت پر ناراض نہیں کر سکتا تھا، بادل نخواستہ وہ اُن کے کہنے پر چٹائی پر لیٹ گیا، کچھ دیر بعد جب ماسٹر جی اٹھے تو اُس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا، اُس کو خود کے بارے میں ایک بار پھر یقین ہو گیا تھا کہ وہ کچھ مختلف ہے۔

وہ نم آلود آنکھوں سے انھیں دیکھتا ہوا گھر چلا گیا تھا دوسرے دن وہ نہ سکول گیا تھا نہ ٹیوشن لیکن تیسرے دن وہ پھر وہیں لیٹا ہوا تھا اور پھر جیسے یہ معمول بن گیا، وہ روزانہ اپنے آپ کو ٹوکتا، خود سے لڑتا لیکن روک نہ پاتا تھا۔

تب اُس کے سر میں دھند بہت کم آتی تھی اور دلدل بھی جیسے خشک ہو رہی تھی لیکن اب وہ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ایسے محسوس کرتا تھا جیسے اُس کی پیٹھ گیلی ہو، جیسے اُس کے کپڑوں پر کوئی دھبہ لگا ہوا ہو جیسے اس کے جسم پر کوئی اشتہار چسپاں تھا، وہ اکثر مڑ کر دیکھتا، کسی اوٹ میں جا کر جسم کو چاروں طرف سے دیکھتا، کبھی بھی کچھ بھی نہ ہوتا لیکن پھر بھی وہ ہمیشہ محسوس کرتا جیسے کچھ لگا ہوا تھا۔
جیسے گوند سے کوئی اشتہار چسپاں ہو۔

وہ ابا سے ہار گیا تھا، اب اُسے ابا کی ساری باتیں سچی لگتیں اور سب نظریں با معنی معلوم ہوتیں تھیں۔ ایک دن وہ اپنے تصور میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا کہ اچانک وہ چونک اٹھا، وہ دوسرا لڑکا کہاں گیا، وہ بے باک، مضبوط اور دلیر سا لڑکا کہاں تھا۔۔۔۔

ابا سے نظریں چرانے کے لئے پہلے اُس نے گھر چھوڑا، پھر شہر اور

آج پندرہ برس بعد وہ امریکہ میں مقیم تھا اور اپنے نئے پارٹنر کے ساتھ ایک فلیٹ میں رہائش پذیر تھا۔ وہ صوفے سے اٹھا اور دیوار پر لگی ماں کی تصویر کے فریم کو اتار کر اس پر انگلیاں پھیرنے لگا۔۔

حرافہ

شازیہ ہونقوں کی طرح اپنے خاوند جاوید کا منہ دیکھتی رہ گئی،

. حرافہ ،سالی بازاری عورت کی بیٹی

تیری ماں کی۔۔۔۔۔۔۔۔،

میرے ساتھ تمسخر کرتی ہے۔۔۔۔۔۔فاحشہ۔

جاوید۔۔۔۔میں تو۔۔۔۔۔

آپ میری ماں کو۔۔۔۔۔۔

شازیہ کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔

ہاں تو کیا کہوں کتیا کی بچی، ایک کتیا کو انسان کتیا نہ کہے تو کیا کہے، حرافہ ، حرافہ ، حرافہ۔۔۔ایک بار نہیں سو بار کہوں گا۔۔۔

وہ ایک ہی سانس میں ایسے شازیہ اور اُس کی ماں کو مغلظات بکے جا رہا تھا جیسے بہت دنوں سے یہ غلیظ القاب و آداب اُس کے حلق میں جمع تھے اور اُسے بس کسی موقع کی تلاش کسی ہلکے سے بہانے کی ضرورت تھی۔

شازیہ کے کان بند اور دماغ ماؤف ہو چکا تھا، وہ ہونقوں کی طرح چند لمحے اپنے خاوند کے تیز تیز ہلتے لبوں اور آنکھوں سے نکلتے شعلوں کو دیکھتی رہی اور پھر مٹھیاں بھینچتی ہوئی خودکارانداز میں اٹھ کر بیڈروم سے نکل گئی،

کرب، خوشی، پیار دکھ، تکلیف،۔۔۔ جذبات کا فقط احساس کیا جا سکتا ہے ان کا اظہار کرنے سے یہ کبھی بیان نہیں ہوتے

شازیہ کو جاوید کے منہ سے اپنی ماں کے لئے ایسی گالیاں سن کر جو اذیت ملتی تھی اُس کا وہ فقط احساس ہی کر سکتی تھی، اُس کیفیت کا اظہار ممکن نہ تھا۔ کاش وہ جاوید کو احساس دلا سکتی، جواب دے سکتی۔۔۔۔۔ لیکن جواب۔۔۔۔ وہ جاوید کو جانتی تھی وہ واپس بولنے یا جواب دینے کو اپنی آخری درجے کی توہین سمجھتا تھا اور ایسی صورت میں فیصلہ طلاق پر ہی رکتا۔۔۔۔

طلاق۔۔۔۔۔ نہیں طلاق کیوں؟۔۔۔

وہ چاہتی تھی کہ جاوید کو اُس کیفیت کا احساس ہو، وہ بھی اُس کرب کو محسوس کرے جس سے وہ گزرتی تھی لیکن اِس کے باوجود جب اُسکی آنکھوں میں آنسو امڈنے لگتے تو وہ اپنے زیریں ہونٹ کا اندرونی حصہ دانتوں تلے دبا کر اپنے آنسوؤں کو روک لیتی، کم از کم اُس وقت تک جب تک وہ جاوید کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتی۔۔۔

شازیہ کو یہ تو گوارا تھا کہ وہ اس اذیت کے خاتمے کے لئے جاوید کے خود بخود سدھر جانے یا اُس کو سدھارنے کا کوئی

طریقہ ہاتھ آنے تک کے وقت کا انتظار کر لے لیکن اُسے یہ گوارا نہیں تھا کہ جاوید کے سامنے اُسی کے بے بسی کے آنسو نکل پڑیں اور جاوید ترس کھا کر اُس کے ساتھ اپنا برتاؤ تبدیل کرے۔

وہ بچپن ہی سے ایسی تھی، پاپا جب اُسکی ماں کو گالیاں دیتے تھے تو وہ کبھی اپنے روم میں جا کر پاپا کے دیئے ہوئے کھلونے توڑ دیتی اور کبھی اپنی نوٹ بک پر اتنی زور زور سے پین چلاتی کہ صفحے ایڑھی ترچھی لکیروں سے کالے ہو کر تار تار ہو جاتے لیکن وہ پاپا کو کچھ کہہ نہ پاتی،

وہ اپنی ماں کو گالیاں نہ دینے کے لئے اپنے باپ کی منتیں نہیں کر سکتی تھی۔۔۔

حالانکہ جب پاپا اُس کے اور اُس کے چھوٹے بھائی عاصم کے ساتھ کرکٹ کھیلتے ہوئے عاصم کو بازو گھما کر گیند پھینکتے اور شازیہ کی طرف لڑھکتی ہوئی گیند پھینکتے تو وہ تھوڑا سا موڈ بناتی اور پھر واپس کھیلنے لگتی۔۔۔۔

بات یوں ہے کہ عورت کو کسی بھی عمر میں مرد کے مقابل نازک یا کمزور سمجھا جائے تو وہ سہہ جاتی ہے لیکن اُسے کم تر یا حقیر سمجھا جائے تو وہ یقینی طور پر پلٹتی ہے اور چاہے مار کھائے یا پامال ہو جائے ایک بار وار ضرور کرتی ہے۔

، پاپا کے ساتھ پھر بھی ایسا کچھ چل جاتا لیکن جاوید کے ساتھ تو بالکل نہیں، شادی کے دوسرے روز سے ہی وہ جاوید کو اپنا حق اپنا حصہ سمجھتی تھی، رشتے کا ایک مان ہوتا ہے کسی کے جسم وجان کی ضرورت بن جانے کا اپنا ایک غرور ہوتا ہے اور اُسے یہ بالکل گوارا نہ تھا کہ اُسے اپنا حق بھی بھیک میں ملے۔

جاوید شہر میں پیدا ہونے کے باوجود مزاج میں کہیں کہیں اپنے جاگیر دار دادا سے مشابہ تھا,اس کے پاس اپنے دادا کی طرح زمین جائیداد تو نہ تھی لیکن مزاج میں وہی انا پرستی اور دوسروں کو اپنا مزارعہ سمجھے کی عادت سی تھی،اُن کی طرح شکار کھیلنے تو نہ جا سکتا تھا لیکن گھر میں ایک بندوق ضرور رکھی ہوئی تھی جسے ہر ماہ باقاعدگی سے چمکا کر واپس بیڈ روم کی دیوار پر لٹکا دیا جاتا، جاوید اپنے دادا کی طرح بلانوش تو نہیں تھا لیکن کبھی کبھی اپنی مما سے چھپا کر اور شازیہ کو ڈاکٹر کی طرف سے تجویز کردہ بتا کر ایک آدھ بوتل لے ہی آتا تھا، دادا عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتے تھے جاوید اپنے تیئں بیوی کو ایک برتن کی حیثیت دیتا تھا۔

شازیہ کی ساس کے مطابق جاوید کے دادا بھی بہت سخت مزاج اور ضدی تھے لیکن جب جنسی ضروریات کی تسکین کی بات آتی تو وہ سر پر بٹھانے، پاؤں پکڑنے بلکہ بلک کر معافی مانگنے سے بھی نہ چوکتے۔۔۔اب شازیہ اپنی ساس کو کیا بتاتی کہ جاوید بھی بہت بدزبان، سخت مزاج اور اڑیل تھا لیکن بستر پر اس کے مطالبات کی فہرست بہت طویل ہوتی جس میں رکاوٹ دور کرنے کے لئے وہ کچھ بھی کر ڈالتا۔

دادا کو عورت پر صرف سرخ کپڑے ہی اچھے لگتے تھے، جبکہ جاوید شازیہ کو سرخ قمیض اور سفید شلوار بہت شوق سے لے کر دیتا تھا۔

صبح جاوید جب اُس کے ہونٹ چوم کر آفس کے لئے نکلا تو اُس نے اُسے بتایا تھا کہ آج وہ کچھ دیر کے لئے ممی جی کو ساتھ لے کر مارکیٹ جائے گی۔ جاوید نے مسکرا کر یہ کہتے ہوئے اُس کے ہونٹوں پر ایک اور بوسہ ثبت کیا، باہر جاؤ گی تو میری زیادہ یاد ساتھ رہنی چاہیئے۔

لیکن شام کو گھر آتے ہی جاوید کا پارہ کچھ چڑھا ہوا تھا، اس کی وجہ کوئی بھی ہو سکتی تھی، آفس میں کسی کی بات سے توہین محسوس کرنا، تھکاوٹ، گھر میں کوئی بے ترتیبی یا بد نظمی یا شدید جنسی ہیجان جس کی خاطر خواہ تسکین ممکن نہ ہونے کا لاشعوری احساس جاوید کو چڑچڑا کر دیتا تھا۔۔۔

شازیہ یہ تو بھانپ گئی تھی کہ اب جاوید کسی موقع کی تلاش میں ہے لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ احتیاط کر کے اُسے کوئی موقع دیا ہی نہ جائے کیونکہ اگر کوئی وجہ نہ ہو گی تو جاوید اسی اکتاہٹ سے تلملا اٹھے گا کہ سب کچھ پھیکا پھیکا اور جامد سا کیوں ہے۔ اور وہی ہوا شازیہ نے نے جاوید کی خوشامد کے لئے ہلکا سا مسکراتے ہوئے چھیڑ خانی کے انداز میں پوچھ لیا

کیوں حضور، نصیب دشمناں آج جناب کا منہ کیوں پھولا ہوا ہے

. حرافہ ، سالی بازاری عورت کی بیٹی

تیری ماں کی۔۔۔۔۔۔۔۔، میرے ساتھ تمسخر کرتی ہے۔۔۔۔۔۔فاحشہ۔

جاوید۔۔۔۔۔۔ میں تو۔۔۔۔۔آپ میری ماں کو۔۔۔۔۔۔شازیہ کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔

ہاں تو کیا کہوں کتیا کی بچی، ایک کتیا کو انسان کتیا نہ کہے تو کیا کہے، حرافہ ، حرافہ ، حرافہ ۔۔۔ایک بار نہیں سو بار کہوں گا۔۔۔

کبھی کبھی شازیہ کو لگتا وہ جو چاہتا ہے وہ کر نہیں پاتا اس لیے چڑ جاتا ہے، کبھی وہ سوچتی اُس کو جو چاہیئے وہ اُس کو مل نہیں پاتا اس لئے وہ بگڑ جاتا ہے۔ اسی تذبذب میں شازیہ کبھی بہت کھل جاتی اور کبھی بالکل ملفوف ہو جاتی۔ جب وہ شیرنی کی طرح اُس کے آس پاس چکر لگاتی تو جاوید کے باڑے میں بندھا ہوا سانڈھ ایک چھوٹی سی بلی بن کر میاؤں میاؤں کرنے لگتا اور اگر وہ ایک گدھی کی طرح کان لٹکا کر سر نیہوڑائے اپنی پیٹھ پیش کر دیتی تو وہ جھنجلا کر اُس پر برس پڑتا۔

جاوید بہت بُرا سا منہ بنائے، لائٹ آف کئے بیڈ روم میں بیٹھا تھا، شازیہ جانتی تھی کہ اب وہ اپنا حق جانتے ہوئے اس انتظار میں ہے کہ اُسے منایا جائے اور اُس سے معافی مانگی جائے۔ نہ وہ ٹی وی لاؤنج میں آئے گا نہ کھانا کھائے گا نہ باہر واک کے لئے نکلے گا لیکن اگر وہ کچھ دیر اُس کی منت کرے گی معافی مانگے گی تو وہ ایک احسان

کر کے راضی ہو جائے گا کیونکہ کل چھٹی ہے اور اُسے شازیہ سے آج رات کو بہت سا کام تھا۔

شازیہ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ جاوید کو بالکل نہ منائے، خود راضی ہوتا ہے تو ہو نہیں ہوتا تو نہ سہی لیکن اُسے پتہ تھا کہ اس طرح بات زیادہ بگڑے گی اور پھر جب تک شازیہ کی ماں آکر جاوید سے معافی نہیں مانگے گی وہ نہ مانے گا۔ شازیہ کو خود معافی مانگتے ہوئے فقط اپنی انا کو کچلنا ہوتا تھا لیکن جب اماں گھر سے آکر جاوید سے معذرت کرتی اور جاتے ہوئے، گیٹ کے پاس رک کر شازیہ کو سرگوشی میں کہتی، بیٹی تُو میرا برامت مانا کر، مجھے ساری زندگی تیرا باپ گالیاں دیتا رہا ہے اگر جاوید نے مجھے دو گالیاں دے دیں تو کون سی قیامت آگئی، تو اُسے لگتا کہ اُس کی انا کی کرچیاں جاوید کے گھر سے نکل کر اُس کے باپ کے گھر تک کے سارے رستے پر بکھر گئی ہیں اور کبھی گلی میں کرکٹ کھیلتے لڑکوں کے درمیان، کبھی سبزی کے ٹھیلے والے کے پاس کھڑی عورتوں کے درمیان اور کبھی پڑوسیوں کے کار پورچ کے باہر کھڑے ہو کر جاوید اور اُس کا باپ وہ ساری کرچیاں اچھال اچھال کر کھیل رہے ہیں اور قہقہے لگا رہے ہیں۔ اُس کی ماں کے جانے کے بعد جاوید اکثر اسے کہتا، میں تمھاری بات نہیں کر رہا لیکن عورت کی یہی اوقات ہے، پہلے اکڑ دکھائی ہے اور پھر پاؤں میں پڑ جاتی ہے، اکڑ دکھانے کی ضرورت ہی کیا ہے، پہلے ہی عقل کو ہاتھ مار لینا چاہیئے نا۔

وہ کچن میں کھڑی اپنے ساتھ ہی بحث میں الجھی ہوئی تھی۔

شازیہ تیری ماں خود ساری زندگی تیرے باپ سے گالیاں سن کر خاموش رہی وہ تیرا کیا دفاع کرے گی تیرا باپ تو اس دنیا میں ہی نہیں ہے، اوہوں۔۔۔ ہوتا تو کیا ہوتا، ایک دو وہ بھی بک دیتا اور ممی ایک عورت ہونے کے باوجود تیرے لئے فقط ایک ساس ہے۔

وہ اپنی سوچوں میں گم کبھی شعور کے ساتھ اختلاط کر کے کوئی حل پیدا کرنے کی کوشش کرتی اور کبھی خود کو نفرت کے تاریک گوشے میں سر تا پا برہنہ دھکیل دیتی اسی آمادگی کے دوران کہیں سے ایک قطرہ اُس کی جبلت کے بطن میں ٹپک کر ایک ہی لمحے میں ایک نئی شازیہ کی پیدائش کا سبب بن گیا۔۔۔ حرافہ۔۔۔۔۔اچھا تو میں حرافہ ہوں۔۔۔۔ہاں میں ایک فاحشہ بھی تو ہوں۔۔۔۔۔اُس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ رینگ گئی اور اُس کی آنکھوں میں ایک حاملہ عورت کی تسکین ایک غرور سا عود آیا۔۔۔

وہ دبے پاؤں کچن سے نکل کر بیڈ روم کے دروازے سے بچتی ہوئی دوسرے کمرے میں اپنے وارڈروب کی طرف بڑھ گئی اُس نے سرخ قمیض اور سفید شلوار پہنی، قمیض کے تینوں بٹن کھلے چھوڑ کر، دوپٹے کو سرکنے کے انداز میں سینے پر ڈالا اور اپنے زیریں ہونٹ کو اپنے دانتوں کے نیچے سے آزاد کر کے آنسوؤں کو راستہ دیتے ہوئے بیڈ روم میں داخل ہو گئی۔۔۔ جب ذہن میں کوئی منصوبہ کوئی لائحہ عمل ہو توانا ساتھ دینے لگتی ہے وہ بلا تامل جاوید کے پاؤں میں بیٹھ گئی۔۔۔۔۔۔

بات شروع کرنے کے لئے معافی مانگنا ضروری تھا لیکن اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ کس بات کی معافی مانگے، بضاہر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔۔۔۔ کیا وہ نامعلوم غلطی کی معافی مانگے یا موڈ خراب ہونے کی وجہ پوچھنے کی معافی مانگے اگر وہ کسی ایسی بات کی معافی مانگے گی جو جاوید کے ذہن میں نہیں ہے تو بھی جاوید چیخ اٹھے گا کہ تمھیں معلوم ہی نہیں ہے کہ تمھاری غلطی کیا ہے تو تم اپنی اصلاح کیسے کرو گی۔۔۔۔ اُس نے بات کرنے کی بجائے اپنے آنسوؤں کو گالوں تک پہنچایا اور غیر محسوس طریقے سے اپنا دوپٹہ سر کا کر اپنے دونوں ہاتھ جاوید کے پاؤں پر رکھ دیئے، وہ اپنے جسم اور جاوید کی ضرورت کو اپنا وکیل بنا رہی تھی۔۔۔

بات یوں ہے کہ جنسی عمل کیسے تکمیل کو پہنچانا ہے یہ مرد کی جبلت میں ودیعت شدہ ہوتا ہے اگر کسی مرد نے زندگی میں کبھی بھی قربت نہ کی ہو تب بھی وہ پہلی رات کو جانتا ہے کہ کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے کچھ یونہی مقاربت کے تجربے سے گزری ہوئی عورت کو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی کس ادا کی کیا قیمت ہے اور یہ کیسے وصول کی جاسکتی ہے۔۔۔ کیا یہ ستم ظریفی نہیں ہے کہ اکثر عورت کو ادافروشی کی ابتدائی تربیت وہی مرد دیتا ہے جس کو وہ سب کچھ مفت میں پیش کرتی ہے۔

آج جیسے شیرنی اور گدھی کے انضمام سے ایک نئے حیوان نے جنم لیا تھا، شازیہ جاوید کی آغوش میں دھاڑنے لگتی تو اُس کی بے بسی اُس کو نیچے بٹھا دیتی اور جب وہ لیٹ جاتی تو سینے میں چبھی ہوئی کرچیاں اُس کو ایک زخمی درندہ بنا کر واپس اوپر لے آتیں، آج جاوید کی حالت دیدنی تھی، وہ یہی تو چاہتا تھا، ایک جوالا مکھی ہو لیکن ہو

اُس کے قابو میں۔۔۔۔۔۔۔ ایک اڑیل مست گھوڑی ہو لیکن اُس کے ہاتھوں میں پکڑی باگوں سے زخمی اور بے بس ہو۔۔۔۔۔ شازیہ جان گئی کہ جاوید کے چڑ چڑے پن کی کیا وجہ ہے لیکن اُس لمحے اُس پر یہ بھی انکشاف ہو گیا کہ جاوید کے باڑے میں بندھے جانور کو سانڈھ یا بلی بنانا اُس کے ہاتھ میں ہے نہ کہ جاوید کے بس میں۔

جاوید کے نرخرے سے بسمل کی طرح آوازیں نکل رہی تھیں اور پھر اچانک وہ آوازیں بامعنی الفاظ میں بدل گئیں، جاوید آنکھیں بند کئے نشے کے انداز میں زیر لب، شازیہ کو گالیاں دے رہا تھا، شازیہ تیرا سحر تو کسی طوائف کی طرح ہے، تیرے جسم میں جیسے سات عورتوں کی گرمی اور نشہ بھرا ہوا ہے، بازاری، رنڈی مجھے نشے میں پاگل کر دے گی کیا۔۔۔ جوں جوں وہ اُس کو غلیظ ناموں سے پکار کر دبوچتا، شازیہ کی تسکین بڑھتی جاتی اور اُس کی حالت پہلے سے زیادہ مدہوش ہوتی جاتی۔ یہ گالیاں مختلف تھیں، وہ اپنی بے بسی اور شازیہ کے سحر، اُس کی جوانی کی جولانی کا اقرار اور اظہار کر رہا تھا۔ یہ معین سا فرق کم عمر و نازک اور کم تر و ناقص کے فرق جیسا تھا، یہ ایسے ہی تھا جیسے بچے کے ساتھ باکسنگ کھیلتے ہوئے اُسے مکہ مارو تو وہ ہنستا ہے لیکن غصہ کر کے دو انگلیوں کی چپت بھی لگا دو تو وہ بلکنے لگتا ہے۔

شازیہ نے آنکھیں موندے موندے ہی ہاتھ بڑھا کر بیڈ کے سائیڈ ٹیبل سے جاوید کی چھپائی ہوئی چھوٹی سی بوتل نکالی اور ایک گھونٹ حلق میں انڈھیل کر باقی جاوید کے منہ کے ساتھ لگا دی۔ وہ جاوید سے بھی کچھ بلند آواز میں غرانے لگی،

وہ دھیرے سے شازیہ کے کان میں بولا خاموش نہیں رہو، تم بھی کچھ بولو، کچھ ایسا کہو جس سے آگ پھیلتی جائے۔

صبح جاوید کو آفس بھیج کر شازیہ باتھ روم کا دروازہ لاک کئے بغیر ہی شاور کے نیچے کھڑی ہو گئی۔۔۔اُس کو شاور کے نیچے بھیگتے ہوئے اپنے جوان بدن کا لمس اور بھر پور نظارہ ایک عجیب احساس تحفظ دے رہا تھا۔۔۔۔

گلی میں بکھری ساری کرچیاں جیسے سینے کے اندر چلی گئی تھیں،۔

اس بار اُس نے اپنی ماں کو فون کر کے جاوید کی بد کلامی کا رونا نہیں رویا تھا۔

،دو تین دن سکون سے گزر گئے جاوید آخری چپقلش کو بھول بھی گیا تھا،اور شازیہ تو۔۔۔۔، کچھ دن پہلے تک جو شازیہ جاوید کو دوائی کے بہانے بھی گھر میں پینے پلانے کا کچھ لانے دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی وہ اب یہ سوچ رہی تھی کہ کیسے جاوید کا دھیان اس طرف لایا جائے کہ وہ ایک اور بوتل لے آئے۔

آج تیسرے چوتھے دن جب شازیہ کی ماں کا فون آیا تو وہ پہلے کی طرح ایک دم پھوٹ پڑنے کی بجائے تحمل سے بات کرتی رہی، ماں نے حال احوال پوچھ کر اُسے قران خوانی کے لئے آنے کا کہا۔۔۔۔ شازیہ نے خوش طبعی سے بات کی اور فون رکھ دیا۔

جاوید پھر کچھ مائل تھا، ہلکی ہلکی گپ شپ اور بوس و کنار کا موسم چل رہا تھا، شازیہ کے اندر جنی گئی حرافہ بے چینی سے باہر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن کوئی رستہ نہیں مل رہا تھا۔

جاوید صبح آپ کے آفس جانے کے بعد میں کچھ دیر کے لئے اماں کے ہاں جاؤں گی،

کیوں کیا ہوا چھٹی والے دن خود لے جاؤں گا ناں، جاوید نے اُسے گود میں بھرتے ہوئے کہا۔۔۔

نہیں کل اماں کے ہاں قران خوانی ہے، بس دو گھنٹوں میں واپس آجاؤں گی۔۔۔

اچھا تو پھر ممی کو یا آسیہ کو لے جاؤ۔۔۔

ممی جی سے پوچھوں گی اگر جائیں تو

آسیہ کو تو نہیں لے جاسکتی، قران خوانی کی محفل ہے اور اُس کے ماہواری کے دن چل رہے ہیں، اچھا نہیں لگتا ناں۔۔

جاوید ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔۔۔

کیا بے ہودگی ہے شازیہ، جاہل ہو تم بالکل

ارے کیا ہوا، کیا کیا میں نے ؟

تمھارے گھر میں ایسا چلتا ہو گا بے غیرت کی بچی ہمارے ہاں نہیں۔۔۔۔

ہم کس کیفیت میں بیٹھے ہیں، کیا کر رہے ہیں اور تم مجھے میری جوان بہن کے بارے میں بتا رہی ہو کہ اُس کے۔۔۔۔۔۔

جاوید کی حالت ایسے بھوکے کی ہو گئی جو نوالہ منہ میں ڈالنے لگا تھا اور کسی نے اچانک اُسے بتا دیا کہ کھانے میں غلاظت ملی ہوئی ہے۔

وہ ہیجانی سے انداز میں اٹھا اور باتھ روم میں گھس گیا۔۔۔

شازیہ حیرت سے پاس بیٹھی حرافہ کو دیکھ رہی تھی جو اچانک اس کے اندر سے نکل کر بستر پر اُس کے پاس بیٹھ گئی تھی۔

جاوید کافی دیر کے بعد اپنے دھیان کو بٹا پایا لیکن اس بار کمرے میں بوس و کنار کی سرگوشیاں ایسے رینگ رہی تھیں جیسے سالن سے مکھی نکال کر دوبارہ کھانا شروع کرنے والا مزا آنے کا اظہار کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

شازیہ کو خفیف سی شرمندگی ہوئی کہ اُس نے جاوید کو جذباتی دھچکا دیا لیکن جاوید کی گالی نے شرمندگی کے احساس کو ڈھٹائی میں بدل دیا اُدھر جاوید نے اپنا غصہ کسی مناسب موقع پر پوری شدت سے نکالنے کے لئے سنبھال لیا۔

شازیہ مہینے کے آخری ایام میں پورے ہفتے کے بعد نہا دھو کر صاف ہوئی۔ دوپہر کو وہ ممی کو لے کر مارکیٹ تک گئی اور کچھ زیر جامے اور دیگر چھوٹی موٹی اشیاء خریدیں، واپسی پر اُس نے ممی کو سفید پھولوں والی ایک سرخ قمیض لے کر تحفہ میں دی، گھر آکر جب جاوید کی ماں نے قمیض پہن کر اُسے دکھائی تو اُس نے ضد کر کے انھیں پہنے رکھنے پر راضی کر لیا۔ چھوٹے موٹے کاموں سے فارغ ہو کر سرِ شام ہی اُس نے مچھلی کا سالن بنا کر جاوید کو فون کیا،

کیا بات ہے، اور کتنا انتظار کرائیں گے؟

کیوں کیا ہوا بھئی، کیسا انتظار؟

شام ہونے کو ہے بس اب آ بھی جائیں،

اور ہاں آتے ہوئے اپنی دوا کی بوتل ضرور لیتے آیئے گا، اب میرا گلہ بھی کچھ خراب رہنے لگا ہے، شازیہ نے ماؤتھ پیش میں سرگوشی کی۔

اندھا کیا مانگے؟ دو آنکھیں، جاوید نے سب کام چھوڑے اور دوا کی بوتل لے کر گھر کی راہ لی۔

آج سانڈ باڑے کو توڑ کر باہر لپک رہا تھا، جاوید کی زمینوں کا نالہ پوری تغیانی پر تھا ۔۔۔۔۔ اللہ اللہ کر کے وہ گھر پہنچا ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے بیٹھے ہی جاوید کا ذہن بیڈ روم میں گھوم رہا تھا۔ اُس کی مہربان نظریں بار بار شازیہ کے کولہوں کا جائزہ لیتیں اور وہ پھر سے ایک انگڑائی لے کر صوفے پر نیم دراز ہو جاتا۔

کچھ دیر میں شازیہ خلاف معمول کھانے کی بجائے چائے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئی تو اُس کے پیچھے پیچھے جاوید کی امی اور بہن بھی تھیں، شازیہ نے ٹرالی آگے بڑھاتے ہوئے ممی جی اور آسیہ کو تو چائے دی اور جاوید کو سر گوشی کی، کھانا کمرے میں دوائی کے ساتھ ملے گا۔

جاوید کی ماں نے خاوند کے فوت ہونے کے برسوں بعد اس طرح کے نئے نویلے کپڑے پہنے تھے وہ سرخ قمیض اور سفید شلوار میں بالکل دس پندرہ برس پہلے کی طرح لگ رہی تھیں۔ جاوید کو انھیں ہشاش بشاش دیکھ کر ایک گونا طمانیت محسوس ہوئی، آسیہ اور ممی جی سے باتیں کرتے ہوئے اُس نے ایک دو بار کن اکھیوں سے شازیہ کی طرف دیکھا جو انجان بنی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ جاوید کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد سونے کا کہہ کر بیڈ روم میں گیا تو شازیہ نے اٹھ کر ٹی وی بند کر دیا، جاوید کی بہن اور ماں اٹھ کر اوپر اپنے پورشن میں چلی گئیں۔

پسندیدہ ترین کھانا، تین چار پیگ اور پھر شیرنی اور گدھی کا آمیزہ، آج جاوید بادلوں میں تیرتا پھر رہا تھا، لیکن تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ نظر بچا کے نشے میں جھومتی ہوئی مدہوش شازیہ کو بھی حیرت سے دیکھتا جو اُس کے پر بن کر اُس کو اُڑا رہی تھی۔

جاوید نے شازیہ کو آغوش میں لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی پسندیدہ سرخ قمیض اور سفید شلوار کو دیوار کے ساتھ پڑے سنگل صوفے کی طرف اچھال دیا۔ کمرے کی خاموشی سرگوشیاں کرنے لگی۔ اپنے خمار اور شازیہ کے بھرپور تعاون سے جاوید بہت جلد ہی اُس ترائی میں اترنے لگا جہاں پر رکنا اب اُس کے بس میں نہیں تھا، اُس نے انگیا سرکا کر اپنے ہونٹ آغوش میں پڑے مخملیں تھال میں سجے ہوئے خوشوں پر رکھ دیئے۔

میری نئی انگیا کی کوئی تعریف نہیں،

ہوں۔۔۔۔ بہت خوبصورت ہے، جاوید کے منہ سے الفاظ خود بخود گرنے لگے۔

آج ہی، دو، لائی ہوں، ایک ممی کو دی ہے، کالی والی، جو انھوں نے شام میں پہنی ہوئی تھی اور ایک یہ ہے، سرخ۔

شازیہ۔۔۔۔ جاوید کے حلق سے ایسی گھٹی گھٹی آواز نکلی جیسے کوئی اندھے کنویں میں اترا ہو اور تہہ میں آکسیجن نہ ہونے کی وجہ سے وہاں سے آواز دینے کی کوشش کر رہا ہو۔

شازیہ نے ہاتھ سرکا کر کھلی ہوئی بوتل اٹھائی اور دو خالص گھونٹ نیچے لیٹے ہوئے جاوید کے منہ میں انڈیل کر اُس کے اوپر ہچکولے لینے لگی۔ جاوید اور اُس کی زبان کے درمیاں رابطہ اور کمزور ہو گیا۔۔

جاوید کے نرخرے سے نکلتی ہوئی آوازیں خود بخود الفاظ کا روپ دھارنے لگیں، حرافہ۔۔۔۔مارنے کا ارادہ ہے کیا۔

تُو کیا تیرے جیسی ایک اور بھی آجائے تو اُس کو بھی بے حال کر دوں۔۔

شازیہ نے جاوید کے سینے کے بال ہلکے سے کھینچ کر کان کی لو پر زبان پھیرتے ہوئے سرگوشی کی۔

پتہ نہیں میرا اور ماں جی کا دیکھنے میں سائز تو ایک ہی ہے لیکن مجھے یہ ذرا ڈھیلی ہے۔

اوہ، شازیہ۔۔۔جاوید دلدل میں ڈوبتے ہوئے جسم کی طرح بے سود تگ و دو کرنے لگا۔

اُن کا سینہ تو اب بھی ایسے سنبھالا ہوا ہے کہ رشک آتا ہے۔۔۔۔

برسوں سے کسی نے۔۔۔۔۔۔

جاوید کی زبان سے جملہ تو پھسل گیا لیکن کنواں جیسے پاتال میں بدل گیا۔

نشے کے خمار میں ذلت کی کھٹاس گھلنے لگی۔۔

جاوید نے شیر کے پنجوں میں آئی ہوئی ہرنی کی سی نظروں سے ہوا میں جھومتی شازیہ کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کہا، چپ ہو جا رنڈی خدا کے لئے چپ ہو جا یا مجھ سے دور ہو جا۔۔۔۔ یا تو میرے دماغ کی نسیں پھاڑ دے گی یا پھر مجھے میری نظر میں ہی۔۔۔

شازیہ نے نیچے لیٹے ہوئے جاوید پر ایک ذلت آمیز نگاہ ڈالی اور مزید جارحانہ انداز اپنالیا۔

پلائی کی دیوار پر لٹکی بندوق بیڈ کے ہچکولوں سے نیچے گری اور پرانی لکڑی کا دستہ درمیان سے دو ٹکڑے ہو گیا۔

شازیہ طلاق کا خوف جاوید کے سینے پر تھوک کر اُسے ہاتھ سے ملتے ہوئے نشے میں بُڑ بُڑائی،

تیری ماں کی۔۔۔۔،

رنڈی کے بچے،

پہلے ہی عقل کو ہاتھ۔مارنا چاہئے نا۔

بعد میں ہاتھ جوڑنے کا کیا فائدہ۔

یوسا

یوسف حسین نے ایک جھٹکے سے سائیکل سٹینڈ پر کھڑی کی۔ دودھ کے دونوں ڈول اتار کر نیچے رکھے اور حاجی کے ہوٹل کے باہر لگی چارپائیوں میں سے ایک خالی چارپائی کی طرف بڑھنے لگا۔

اوئے پیجی چائے لے آ ، یوسے نے ہوٹل کے چھوٹے کو آواز دی۔ ،ابھی لے آؤں چاچا یا چاچے نورے اور چاچے فیکے کو آنے دوں؟ نہیں اوئے فیکے کے بچے ابھی لے آ تجھے کہہ رہا ہوں۔ اُس کے سینے میں آگ لگی ہوئی تھی اور دماغ نے نمبر دار کے پرانے وی سی آر کی طرح فلم کو پھنسا کر ایک ہی سین بار بار چلانا شروع کر دیا تھا۔ اُس نے جیب سے ڈبیا نکال کر سگریٹ سلگائی اور لمبے لمبے کش لینے لگا۔ بنا فلٹر کی سگریٹ جتنا اُس کے منہ کو کڑوا کرتی اور حلق کو جلا رہا تھی وہ اتنے ہی لمبے کش لے رہا تھا۔

وہ دوبارہ ذہن میں پھنسی ہوئی فلم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پیلے گیٹ والے گھر کا اندرونی منظر پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ اس گھر کی بیگم صاحبہ جسے وہ باجی کہتا تھا ڈونگے میں دودھ ڈلوانے کے لئے جب جھکی تو قمیض میں سے اُن کا جسم جھول کر جیسے یوسے کی آنکھوں کے بالکل قریب آ گیا تھا اب نہ تو وہ ہاتھ روک سکتا تھا اور نہ باجی برتن پھینک کر سیدھی ہو سکتی تھیں۔ یوسے کی پانچ چھ دِنوں بعد جیسے

کھل کر حسرت پوری ہوئی تھی۔ وہ ہر دروازہ کھلنے پر متلاشی ہوتا تھا مگر کچھ دِنوں سے بس گزارا ہی ہو رہا تھا۔ دودھ ڈونگے میں ڈلتا رہا اور یوسا دودھ کے ڈولوں کو جی بھر کے دیکھتا رہا۔ اُس کے نتھنوں میں سے ہوتی ہوئی باجی کے پسینے اور مہندی کی ملی جلی خوشبو دماغ کو چڑھ رہی تھی۔ تھے تو یہ چند لمحے مگر جیسے پوری رات گزر گئی لیکن پھر یکدم سورج نکل آیا، دودھ ڈونگے سے چھلکا تو یوسے نے شرمندہ ہو کر جھٹکے سے اپنا ہاتھ اور آنکھیں پیچھے کھینچ لیں۔ باجی کا پھولا ہوا بھدا چہرہ غصے اور شرم سے لال ہو گیا مگر اُس نے ڈھٹائی سے اپنی آنکھوں میں موجود نیند کے خمار کو کچھ مزید گہرا کر کے ایسے تاثر دیا جیسے وہ ابھی تک آدھی سوئی ہوئی ہے۔

یوسے کے کانوں میں دور سے آواز آئی، چاچا۔۔۔ چاء رکھ دی ہے، یوسے نے خیالوں کی دنیا سے نکل کر ہڑبڑا کر پیجی کو جاتے ہوئے دیکھا اور پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگالی۔ چائے کا گرم گرم گھونٹ لے کر اُس نے سڑک پر آگے پیچھے دور تک نگاہ دوڑائی مگر اُسے نہ فیکے کی سائیکل دکھائی دی اور نہ نورے کی ریڑھی۔ اُس نے پیالی میز پر رکھ کر سر نیچے جھکا لیا اور دوبارہ کھو گیا۔

باجی نے دروازہ بند کیا تو یوسے کو جیسے ایک دھچکا سا لگا تھا۔ جیسے گاؤں سے دودھ کے بھرے ڈول لاد کر لاتے ہوئے اچانک اُس کی سائیکل کے نیچے کوئی روڑا آ جاتا تھا یا جیسے سردیوں میں گرم بستر سے اٹھ کر اُسے اپنی بھینسوں ماڑی اور بھوری کے باڑے میں جانا پڑتا تھا تو کمرے سے نکلتے ہوئے اسے جھٹکا لگتا تھا۔

لیکن بھینسوں کے اِس باڑے سے اُس نے پھر اپنے خیالوں کی کھڑکی گرم کمرے کی طرف کھول لی، پیلے گیٹ والے گھر دودھ دے کر سائیکل پر بیٹھتے ہی اُس کی

آنکھوں کے آگے بیگم سلطانہ جو پیلے گیٹ والے گھر کی مالکن تھیں کا تازہ گوندھے ہوئے میدے کی طرح کا چکنا اور پلپلا جسم تھل تھل کرنے لگا۔ پھر خیالوں ہی خیالوں میں اُن کا جسم یوسے کے گھر ڈول میں پڑے مکن کے پیڑوں سے گڈ مڈ ہونے لگا اور مکھن کے پیڑوں کا ذائقہ اُس کے منہ میں گھلنے لگا اُس نے دِل ہی دِل میں مکھن کے پیڑوں پر رکھی ہوئی شکر کی گولیاں منہ میں رکھیں تو اُس کے منہ میں رال جمع ہونے لگی، یوسے نے شکر کی گولیاں اپنی انگلیوں میں پکڑ لیں اور دھیرے دھیرے انھیں مکھن کے پیڑوں پر دوبارہ ٹکانے لگا۔ بس کے چنگاڑتے ہارن نے یوسے کو دوبارہ حاجی کے ہوٹل پر پٹخ دیا۔

چائے کے دو تین گھونٹ پینے کے بعد اُس نے ایک اور سگریٹ سلگایا اور پھر سڑک کی طرف دیکھنے لگا، پتہ نہیں میں جلدی آگیا ہوں آج یا یہ دونوں کہیں مر گئے ہیں۔ یوسے کو یاد آیا کہ شکر اور مکھن میں لتھڑی انگلیاں چاٹتے ہوئے اُسے خیال ہی نہ رہا تھا کہ وہ بڑی کوٹھی تک پہنچ گیا تھا اور دو گھر جنہیں دودھ دینا تھا پیچھے ہی چھوڑ آیا تھا۔ اضطراری کیفیت میں اُس نے سائیکل پیچھے موڑی اور پہلے اُن گھروں میں دودھ دے کر پھر کوٹھی آنے کا سوچا۔ دوبارہ پیلا گیٹ اور اُس کا اندرونی منظر اُس کے دماغ پر چھانے لگا تو اُس نے سر جھٹک کر ایک چھوٹی سی آیت پڑھی اور اپنی بیوی کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی، ناخنوں میں میل اور اوپلوں کی بُو، سلیپروں کے ساتھ گوبر، چہرے پر چھائیاں، فلالین کے گھسے ہوئے کپڑوں میں چھیچھڑوں کی طرح لٹکی ہوئی چھاتیاں سینے پر سجائے، منہ بسورے بغل میں بہتی ناک والے اُس کے دو سالہ بیٹے کالو کو لٹکائے اُس کی بیوی اُس کے خیالوں میں آگئی، یوسے نے

ایک واہیات سی گالی بیوی کو دے کر پھر صبح والے واقعات کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔

پہلے گیٹ کے بعد اور بڑی کوٹھی سے پہلے جن دو گھروں میں اُس نے دودھ دیا وہاں اُس کی نظریں متلاشی رہیں مگر اُسے مایوسی ہوئی، اُس کا جی چاہ رہا تھا کے سب دروازوں پر عورتیں ہی دودھ لینے کے لئے آئیں اور سب نے کھلے گلوں والی قمیضیں پہن رکھی ہوں۔ کاش کوئی ایسی بھی ہو جو اندر بستر سے ہی آواز دے کہ دروازہ کھلا ہے اندر آ جاؤ اور یہاں دودھ ڈال جاؤ۔ ایک عورت نے تو دوپٹہ چہرے کے گرد ایسے لپیٹا ہوا تھا کہ اُس کی ٹھوری سے نیچے نظر ہی نہ جاتی تھی، یوسے نے دِل ہی دِل میں اُس پر لعنت بھیجی اور اُس کے بازوؤں اور جھکنے کے طریقے پر غور کر کے اپنی بھڑاس نکالی۔

سڑک کی دوسری جانب کوٹھی کی طرف جاتے ہوئے اُس نے محسوس کیا کہ اس کے پیٹ میں آگ کا ایک گولہ گھومنے لگا ہے۔ اُسے کوٹھی سے بہت سی امید وابستہ تھی۔ گیٹ کے ساتھ لگا کال بیل کا بٹن دبا کر وہ قمیض کو درست کئے بغیر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ کوئی باہر نہ آیا، کچھ دیر بعد اُس نے دوبارہ گھنٹی بجائی، تیسری بار پھر، مگر اندر جیسے کوئی تھا ہی نہیں۔ وہ واپس لوٹنے لگا تو اندر کے دروازے کے کھلنے کی آواز سنائی دی۔ حسبِ معمول گیٹ کھلنے پر وہ اندر داخل ہوا مگر سامنے بیگم صاحبہ نہیں بلکہ اُس کی بیٹی کھڑی جمائی لے رہی تھی۔ وہ کچھ ہچکچا گیا مگر دوسرے ہی لمحے جیسے اُس کے اندر ایک جنون عود آیا۔ اُس نے بھرپور نظروں سے لڑکی کا جائزہ لیا۔ سولہ سترہ سال کی انتہائی موٹے جسم اور بے تاثر چہرے والی لڑکی تقریباً سوئی ہوئی

ہی تھی، وہ اُسے اپنی بھوری کی طرح لگی۔ یوسے نے جگ ہاتھ میں لینے کی بجائے ڈول اوپر اٹھا کر آگے کو جھکایا، لڑکی نے بند آنکھوں کے ساتھ جھک کر جگ نیچے کیا تو یوسے کی نظریں اُس پر جم گئیں اُس نے ڈول کو آہستہ آہستہ نیچے کرنا شروع کیا، کافی دیر بعد اُس نے مزید جھکنا روکا مگر اتنی دیر میں جگ بھر چکا تھا۔

مایوسی نے اس کے جذبات میں مزید گراوٹ پیدا کر دی۔
دودھ لے کر لڑکی واپس جانے کے لئے مڑی تو جیسے یوسے کے سینے پر کسی نے شہتیر رکھ دیا، اُس کا دم رک گیا۔ لڑکی کی لان کی قمیض پسینے کی نمی کی وجہ سے جسم کے ساتھ پیاز کی جھلی کی طرح چمٹی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کو اُس کے ہاتھ ڈول زمین پر رکھنے کو قدرے ڈھیلے پڑے۔ اُسے لگا جیسے اب وہ اپنے بس میں نہیں ہے وہ ابھی بھاگ کر اُس لڑکی کو پکڑ لے گا۔

لڑکی اتنی دیر میں اندر کے دروازے تک پہنچ چکی تھی، کتے کے بھونکنے کی آواز سے یوسا چونکا اور کوٹھی سے باہر نکل آیا۔ ابھی مزید ایک دو گھروں میں دودھ دینا باقی تھا مگر نہ تو اُس سے سائیکل چل رہی تھی اور نہ دودھ بیچنے کا جی چاہ رہا تھا۔ وہ باقی گھر چھوڑ کر سیدھا اپنے گاؤں کی طرف چل پڑا اور حاجی کے ہوٹل تک پہنچ کر ہی رکا۔

رفیق حسین اور نور محمد یعنی فیکا اور نورا یوسے کے یار تھے۔ وہ دونوں شہر کی اِس آبادی جہاں یوسف دودھ بیچنے آتا تھا سے ذرا باہر مضافات کی بستی میں رہتے تھے یوسف حسین صبح منہ اندھیرے گھر سے دودھ لے کر آٹھ میل کا رستہ سائیکل پر

طے کر کے فیکے اور نورے کی بستی کے پاس سے ہوتا ہوا شہر میں دودھ دینے گھس جاتا اور جب سات بجے کے قریب واپس آ کر حاجی کے ہوٹل پر اپنے دودھ کے ڈول رکھ کر اپنی نائب قاصد کی نوکری کے لئے دفتر جانے لگتا تو وہ دونوں بھی حاجی کے ہوٹل پر آ جاتے، فیکا اپنی سائیکل لے کر جس پر سلائی مشینیں اور پریشر ککر مرمت کرنے کا سامان تھا اور نورا اپنی ریڑھی لے کر جس پر سبزی یا کبھی کبھی پھل ہوتے۔

یوسا تیسرا سگریٹ سلگا رہا تھا کہ اُس کی گردن پر کسی نے ایک دھپا مارا۔ یوسا مڑا تو فیکا منہ دوسری طرف موڑے انجان بنا پیچھے کھڑا تھا اور نورا بھی دس قدم دور ریڑھی دھکیلتا آ رہا تھا۔ کیا بات ہے آج بڑی سویر ماری تو نے فیکا سامنے والی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے چائے کی خالی پیالی کو دیکھ کر بولا، نورا بھی اِس اثناء میں پاس آ چکا تھا، وہ بھی پیالی اور میز کے اوپر بجھائی گئی دو سگرٹوں کے ٹوٹے دیکھتے ہوئے بولا، لگتا ہے کافی دیر سے آیا بیٹھا ہے یار ہمارا شاید آج پھر گرما گرم کہانی ہے کوئی۔

یوسے نے ایک لمبا کش لگا کر کہا سنگیو مجھ سے تو کسی دِن کچھ ہو کے رہے گا یا میں کسی کو گرا لوں گا اور یا پھر گھر والی کو فارغ کر کے اِدھر شہر میں ہی کوئی بیٹھک کرایے پر لے لوں گا۔ دیکھ یوسے ہوش کر، تیری بیوی ہے، دو بیٹیاں ہیں، بیٹا ہے اور بڑی بیٹی تو اب ماشاءاللہ تیرہ چودہ سال کی ہو رہی ہے کسی دِن خود بھی ذلیل ہو گا اور ہمارا بھی گاؤں میں داخلہ بند کرائے گا۔ نورے نے اُسے ڈانٹا۔ ساتھ ہی فیکا بولا ، ہمارے ساتھ بھی اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے مگر وہ سب صرف شغل میلے کی حد تک رہے تو ٹھیک ہے، اصل میں تو اپنی گھر والی پر کچھ خرچہ کرے، کوئی کپڑا لتہ، کوئی

کھلانا پلانا، دوادارو تو تیری یہ حالت ہو ہی نہ مگر ادھر سے تجھے پیسے جوڑنے کا بھی تو جنون ہے نا۔۔۔فیکے کی بات ابھی پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ یوسے نے اُسے ٹوک دیا اور اُٹھ کر حاجی سے آج کچھ زیادہ بچ جانے والے دودھ کی بات کرنے چلا گیا۔

شام کو یوسف حسین گھر کے قریب پہنچا تو اُس نے محسوس کیا کہ صبح والے واقعات اس کی رگوں میں کہیں سو گئے تھے جواب گرم لاوا بن کر ادوڑنے لگے ہیں۔ گھر میں داخل ہوتے ہی غسل خانے کے ساتھ بھینسوں کا برآمدہ نما کمرہ تھا، پھر صحن اور پھر سونے کے دو کمرے اور باورچی خانہ۔ سائیکل کھڑی کر کے وہ بھینسوں کے پاس گیا، ماندی کو اُس نے دیکھا اور دھکیل کر ایک طرف کر دیا، کم ذات کی ایسے ہڈیاں نکلی ہوئی ہیں جیسے کھانے کو کچھ ملتا ہی نہیں اِسے، پھر وہ بھوری کی طرف بڑھا، بھوری کا بھرا ہوا جسم دیکھ کر اُس کا جی خوش ہو جاتا تھا، اُس نے بھوری کی پیٹھ پر بڑے والہانہ انداز میں ہاتھ پھیرا، اُس کی رگوں کا لاوا دماغ کی طرف چڑھنے لگا، یوسے نے دونوں ہاتھ بھوری کی پیٹھ پر پھیرنے شروع کر دیئے پھر ناخنوں سے ہلکی ہلکی خراش کرنے لگا جیسے اوپر سے کوئی جھلی اُتار رہا ہو۔

بچے قرآن پڑھنے مسجد گئے ہوئے تھے، یوسف صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ گیا، بیوی نے چائے کا پیالہ لا کر پکڑایا اور پائنتی پر چھڑھ کر بیٹھ گئی، یوسے نے چائے کے ایک

دو گھونٹ لئے مگر پھر پیالہ پاس پڑی تپائی پر رکھ کر چارپائی پر نیم دراز ہو گیا اور ٹانگیں پسار کر انھیں اکڑانے لگا ۔وہ پائنتی کی رسی میں پاؤں پھنسا کر کھینچتا اور پھر گردن پیچھے لٹکا کر سینہ پھلاتا۔

اس کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ اس کی بیوی اس کی ران پر ہاتھ رکھے اور خود سے کوئی بات کرے، یوسے کا ہاتھ بار بار حرکت کرنے کو بے چین ہوتا لیکن وہ اُسے روک کر پاؤں کے انگوٹھے سے پائنتی پر بیٹھی بیوی کی ران کو چھوتا، اُس کے ذہن میں الفاظ گردش کرتے لیکن وہ اپنی زبان کو روک کر بیوی کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

اُس کی ہیجانی کیفیت اور بے بسی نے اُس کی انا کے احساس کو چابک مار دیا تھا زبان سے اقرار یا جسمانی حرکات سے اپنی شدید ضرورت کے اظہار کا خیال اُس کی انا کو مجروح کر کے اس کے شہوانی جذبات کو تذلیل کے رنگ میں رنگ رہا تھا۔

اُس کی بیوی نے اُس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا، اور چارپائی سے نیچے لٹکی ہوئی اپنی ٹانگ کو اٹھا کر اوپر رکھا، یوسے کے دل میں ابلتا لاوا پھٹنے کے قریب پہنچ گیا وہ بیوی کے چہرے پر نظریں جما کر اس کے ہاتھ کا انتظار کرنے لگا۔ دفعتاً یوسے کے بیوی نے نظریں جھکا لیں اور چارپائی کے بان سے تنکا توڑتے ہوئے بولی ،پہلے تو کوئی وزن اٹھاتے ہوئے پیٹ پر کھینچ پڑتی تھی مگر اب تو ایک ذرا سی جھکنے پر بھی ٹیس سی اٹھتی ہے اور پیشاب میں خون بھی آنے لگا ہے۔

تم شہر کے کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلو نہ مجھے کبھی، جب سے طہری پیدا ہوا ہے اُس کر موجلی دائی نے تو میرا سارا "اندر" ہی خراب کر کے رکھ دیا ہے۔

لگتا ہے جیسے ہڈیوں میں پانی پڑ گیا ہے۔ اب تو سوچ رہی تھی تم سے کہوں کہ دونوں نہیں تو کم سے کم ایک بھینس تو بیچ ہی دو، اب نہیں سنبھالی جاتیں مجھ سے۔

یوسے کو پتہ ہی نہ چلا کہ کب اُس کی ٹانگ پائنتی کی رسی سے چھوٹی اور کب بیوی کی پسلیوں میں جا دھنسی، پھر دوسری تیسری اور پھر نہ جانے کتنی، اُسے تو ہوش اُس وقت آیا جب وہ چارپائی سے نیچے جا گری اور یوسا اُسے کراہتا ہوا چھوڑ کر باہر نکل گیا گھر سے نکل کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر چند قدم کے فاصلے پر لگے ٹاہلی کے درخت کے نیچے جا بیٹھا۔

جیب سے دودھ کے حساب کی چھوٹی سی ڈائری نکال کر آج کے ناغے والے گھروں کا نشان لگاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ کیسی گھٹیا عورت ہے میرے کسی کام کی تو رہی نہیں اب بھینسوں کے پیچھے پڑی ہوئی ہے کہ انھیں بھی بیچ دو، اوں ۔۔۔جو چار پیسے آتے ہیں اُن سے بھی جاؤں۔

نجمہ

(۱)

نجمہ پلاسٹک کی کرسی اور تپائی صحن میں بچھائے سہ پہر کی جاتی دھوپ میں اپنی کمر سینکتی شام کی ترکاری کے لئے سبزی کاٹنے میں مصروف تھی۔

یہ راولپنڈی کے ایک مضافاتی علاقے میں واقع چھوٹی سے آبادی کے بیچوں بیچ کا درمیانے درجے کا گھر ہے۔

آبادی کے زیادہ تر گھر ایک منزلہ ہیں، کچھ جگہوں پر تعمیراتی کام وغیرہ ہورہے ہیں اِس گھر، جس میں نجمہ رہتی ہے کے سامنے والے مکانوں کی قطار کے پیچھے کچھ جدید طرز کے اور دومنزلہ مکانات ہیں۔

وہ دبے پاؤں گھر کے اندرداخل ہوا۔ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا ہوا وہ بے خبر نجمہ کی کمر کے قریب پہنچا اور اُس کی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر اپنی سانسیں روک کر جسم ساکت کرلیا۔ نجمہ کا جسم ایک لمحے کے لئے لرز کر رہ گیا اُس نے بُری طرح سے خوف اور بوکھلاہٹ کی جھرجھری لی لیکن اگلے ہی لمحے اُس کا جسم ایسے ڈھیلا پڑ گیا جیسے کٹی ہوئی پتنگ زمین کے قریب پہنچ کر آہستہ سے ٹِک جاتی ہے اور ایک خوف ناک چیخ جو اُس کے سینے سے اچھل کر حلق تک آچکی تھی ایک خوبصورت سی جھنجھلاہٹ آمیز ہنسی میں تبدیل ہوگئی۔

اُس نے اپنی آنکھوں پر رکھے ہوئے عارف کے دونوں ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے دھیرے سے کہا، اپنا چہرہ چھپا سکتے ہیں، اپنی سانسیں روک سکتے ہیں مگر اپنی خوشبو اور اپنے ہاتھوں کا لمس بھی چھپایا ہوتا ناں بھلا یہ ممکن ہے کہ میں اُن ہاتھوں کو نہ پہچان پاؤں جنھوں نے میرا گھونگھٹ اُٹھایا تھا، اِس لمس نے میرے تن من کو ایک کلی کی طرح کھل کے پھول بننا سکھایا اور مجھے تحفظ کے احساس سے آشنا کیا، میرے زخموں اور میرے درد کو مسیحائی سے متعارف کرایا اور یہ خوشبو یہ خوشبو تو میری روح میں بسی ہے یہ تو میری سانسوں کا حصہ ہے اِس خوشبو نے تو پہلی بار میری نرگسیت۔۔۔۔۔

بس بس بس۔۔۔ خدا کی بندی اتنی مشکل باتیں۔۔۔ توبہ ہے یار۔۔۔ کون سمجھے اتنی گہرائی میں جا کر اِن شاعروں اور ادیبوں جیسی باتوں کو سارا مزا کر کرا کر دیا میری شرارت کا۔

میں سمجھا ڈر جاؤ گی اچانک۔۔۔ عارف جھنجلاہٹ دکھاتے ہوئے بولا۔

عارف کو نجمہ پر ایسا اعتماد تھا جیسا خدا جیسی کسی ہستی پر ہوتا ہے۔ عارف اکثر سوچا کرتا تھا کہ میری نجمہ کردار کے حوالے سے بالکل میری ماں جیسی ہے۔

اچھا، بچے کہاں ہیں دونوں نظر نہیں آرہے۔ عارف نے کونے میں پڑی کرسی کھینچ کر نجمہ کے سامنے کر کے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

ہائیں بچے۔۔ کیا مطلب؟۔۔۔ آپ آج جلدی آ گئے ہیں سٹور سے۔۔ بچے تو اپنے وقت پر ہی آئیں گے، ابھی ابھی تو قرآن پڑھنے گئے ہیں۔

ساڑھے چار سے ساڑھے پانچ بجے تک وقت ہے، نجمہ نے تفصیل بتائی۔

بیچارے چھوٹے چھوٹے سے تو ہیں بہت تھک جاتے ہیں صبح سکول، پھر ہوم ورک اور پھر شام سیپارے کے لیے،

چلو یہ بھی تو ضروری ہے ناں پڑھیں گے تبھی کچھ بنیں گے بھی۔ عارف خود ہی اپنی بات کے جواب میں بولا۔

ہاں یہ تو ہے۔ نجمہ نے کٹی ہوئی سبزی کی ٹرے میں چھری رکھ کر اُسے اٹھایا اور دوسرے ہاتھ میں چھلکوں کا ڈونگا اُٹھا کر کرسی سے اُٹھتی ہوئی بولی میں یہ کچن میں رکھ کر آئی۔۔۔ بلکہ آپ منہ ہاتھ دھو لیں میں چائے بنا کر لاتی ہوں اور آج دونوں صحن میں ہی بیٹھ کر چائے پیتے ہیں اتوار کے علاوہ تو کبھی اِس وقت آپ کے ساتھ صحن میں بیٹھنے یا چائے پینے کا موقع ہی نہیں ملا۔ آج عجیب سا لگ رہا ہے ناں۔

ہاں میں بھی ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہا ہوں۔

ویسے آج اتنا جلدی کیسے آ گئے ہیں جناب؟ وہ کچن کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔

تم چائے بنا کر لاؤ میں منہ ہاتھ دھو لوں پھر بیٹھ کر بتاتا ہوں عارف نے باتھ روم کے دروازے پر رُک کر کہا اور اندر داخل ہو گیا۔

نجمہ نے کچن میں جا کر برتنوں کے شیلف سے چائے کے لئے دیگچی نکالی، خارجی حالت کی اچانک تبدیلی کی وجہ سے وہ خیالوں میں گم ہو گئی، اُسے آٹھ سال پہلے کا کمیٹی چوک میں واقع اپنی امی کے گھر کا کچن یاد آ گیا وہ بالکل اِسی طرح چائے کی دیگچی

برتنوں کے شیلف سے نکال رہی تھی کہ ابو امی کے کمرے سے ابو کی ترش آواز سنائی دی تھی۔

ٹھیک ہے ٹھیک نجمہ کی ماں، میں مانتا ہوں کہ وہ خود ایک اچھا لڑکا ہے مگر انھیں کیا پتہ کہ ہم نے نجمہ کو کیسے پالا ہے، وہ تو دس سال سے ناراضگی کے فاصلے بچھائے ہم سے اتنی دور تھے جیسے دوسرے شہر میں نہیں دوسرے ملک یا دوسری دنیا میں ہوں، میرا سوتیلا بھائی ہی تھا ناں کوئی دشمن تو نہیں تھا رشید، مگر اُس نے اکرم کی شادی میں بھی ہمیں نہیں بلایا حالانکہ پہلے بچے کی شادی میں تو وہ خوشی ہوتی ہے کہ انسان ساری دنیا کو دعوت دینا چاہتا ہے
اور پھر بچے ہی کتنے تھے اُس کے صرف دو اکرم کے بعد عارف کے لئے بھی اُس نے کسی نہ کسی اونچے گھرانے پر نظریں لگا رکھی ہوں گی، اُس کا ذہن ہی ایسا ہے ہر شے کو ہر رشتے کو جمع تفریق کے چشمے سے دیکھتا ہے اور تم کہہ رہی ہو کہ بچے ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں بھئی سچی بات ہے میں تو اِس ڈرامے کا قائل ہی نہیں ہوں کہ بچے اپنی مرضی کرنا شروع کر دیں، اِسی لئے میں نجمہ کے کالج جانے کا خلاف تھا۔

اچھا بولیں تو آہستہ وہ کچن میں ہے اور جوان بچیوں کے ذہن پر ایسی سخت باتیں برا اثر ڈالتی ہیں ویسے بھی نہ بھائی نہ بہن اکیلی ہے میری بچی، بات کرے بھی تو کس سے کرے میں تو کہتی ہوں آج کل کے دور میں یہ بھی اُس کی مہربانی ہے کہ اُس

نے مجھ سے بات کر دی ہے ورنہ لڑکیاں اکثر اُس وقت بتاتی ہیں جب پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے۔

اچھا اچھا ٹھیک ہے مجھے کچھ دِن سوچنے دو دیکھتے ہیں کیا کیا جا سکتا ہے اِس معاملے کا۔۔۔۔۔۔

اچانک عارف کی آواز نے نجمہ کو خیالوں کی دنیا سے واپس اپنے کچن میں لا کھڑا کر دیا، عارف نے آواز دے دی ورنہ وہ خیالوں ہی خیالوں میں شاید چائے کی دیگچی کو بغیر کپڑے کے پکڑ لیتی اور اپنا ہاتھ جلا بیٹھتی۔۔۔

جی آئی نجمہ نے آواز دی اور بھاگ کر کچن سے نکل کر باتھ روم کے دروازے پر پہنچی۔ آپ نے کچھ کہا۔۔

جی کہا تو ہم نے تین بار لیکن شکر ہے آپ نے ایک بار تو سن لیا۔۔۔ میرے کپڑے اور تولیہ دروازے پر ڈال دو، ٹھنڈا ٹھنڈا پانی آ رہا ہے اور میں نہانے لگا ہوں۔

کپڑے بدل کر ذرا ایزی ہو جاؤں گا۔

اچھا جی ابھی دیتی ہوں تولیہ اور کپڑے بھی ڈالتی ہوں۔ وہ ہمیشہ عارف کے کپڑے استری کر کے اور موسم اور ضرورت کے مطابق تیار کر کے الماری میں لٹکائے

رکھتی تھی، عارف خود بھی کبھی کبھی جب رومانٹک موڈ میں ہوتا تو اِس بات کا اقرار کرتا، نجو اور تو تم میں کوئی خوبی نہیں مگر یہ ماننا پڑے گا کہ سگھڑ تم بہت ہو۔۔

اچھا جی۔۔۔ ویسے سگھڑ اور خوبصورت ہونے کے علاوہ اور بھی کوئی خوبی ہوتی ہے کیا، سگھڑ آپ نے ہمیں کہہ دیا اور خوبصورت تو ہم ہیں ہی، یہ آپ نہ بھی کہیں تو ہمیں خود معلوم ہے۔ پورا کالج مانتا تھا۔ وہ یہ کہہ کر شرارت سے بیڈ کی دوسری طرف بھاگ جاتی اور عارف ہمیشہ مصنوعی غصے کا اظہار کر کے اُسے پکڑنے کے لئے اُس کے پیچھے بھاگتا کبھی کبھی جب وہ سینما سے یا کسی شادی کی تقریب سے رات گئے آتے اور یہ بات ہوتی تو عارف صرف پیچھے نہ بھاگتا بلکہ اُسے پکڑ کر نیچے گرا لیتا اور وہ اپنی قسمت پر نازاں ہو کر خود سپردگی کی حسین و جمیل وادیوں میں اُتر جاتی۔

نجمہ شلوار اور تولیہ باتھ روم کے دروازے پر ڈال کر جلدی جلدی چائے کو دیکھنے واپس کچن میں چلی گئی۔ شکر ہے اگر ایک منٹ بھی لیٹ ہو جاتی تو ساری چائے چولہے پر گر جاتی، اُس نے کیتلی میں چائے ڈالی اور باہر تپائی پر لا کر رکھ رکھی، اپنی اور عارف کی پیالی کو ترتیب سے رکھ کر وہ عارف کے باتھ روم سے نکلنے کا انتظار کرنے کرسی پر بیٹھ گئی، ایک بار پھر اُسے عارف کا سٹور سے جلدی آکر سرپرائز دینا، آنکھوں پر ہاتھ رکھنا، پیار سے ڈانٹنا یاد آگیا، وہ دِل ہی دِل میں انگڑائیاں لینے لگی، دفعتاًاُس کے وجود نے خوف کی ایک جھرجھری لی، اُسے ماضی کا وہ دِن دوبارہ یاد آ

گیا، جب وہ کالج سے خوشی خوشی واپس آ کر گھر میں داخل ہوئی تو امی ابو میں پھر تلخی چل رہی تھی لیکن اُس دن ابو کے لہجے میں زیادہ سختی اور فیصلہ کن انکار شامل تھا۔

اُس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے ابو نے اُسے اپنے کمرے میں جانے کا کہا اور جب وہ اپنے کمرے میں آ کر پریشان سی ہو کر بیٹھ گئی تو ابو کی آواز سنائی دینے لگی۔ اچھا ہوا یہ بھی موقع پر ہی آ گئی ہے تم بس اِس کو بتا دو کہ یہ خیال دِل سے نکال دے اب کوئی صورت نہیں رہ گئی میں رشید سے اپنی مزید بے عزتی نہیں کروا سکتا۔ اب تم لوگ مجھ پر کوئی گلہ نہیں کر سکتیں۔ کچھ دیر بعد امی کمرے میں آئیں تو ادھر اُدھر کی چند باتیں کرنے کے بعد انھوں نے بڑے پیار سے نجمہ کو پاس بٹھا کر بات شروع کی دیکھو بیٹا تم ہماری ایک ہی ایک اولاد ہو تمھیں تو پتہ ہے تمھارے ابو نے کتنے مشکل حالات میں زندگی گزاری مگر تمھیں پڑھانے لکھانے میں کوئی کمی نہ چھوڑی، وہ تم سے بہت پیار کرتے ہیں، لیکن آج تمھارے ملک انکل اور آنٹی آئے تھے۔ آئے تو وہ بچوں کو اسلام آباد دکھانے کے لئے تھے مگر لاہور واپسی پر ملنے ملانے ہمارے ہاں بھی آ گئے۔

ملک صاحب تمھارے ابو کو بتا رہے تھے کہ تمھارے رشید تایا نے کہیں باتوں باتوں میں کہا ہے کہ بیٹے کے لیے رشتہ دیکھ رہا ہوں۔ لڑکا تو شریف کے گھر رشتہ

کرنا چاہتا ہے مگر اپنے جیتے جی میں ایسا نہیں ہونے دوں گا مجھے شریف سے کوئی مزید رشتہ داری نہیں پالنی ہے۔

بیٹا اب ہمارے بس میں کچھ نہیں رہا ہم تو لڑکی والے ہیں پہلے بھی بات نہیں چلا سکتے تھے مگر تم ہی ضد کر رہی تھی کہ عارف اپنے امی ابو کو بھیجے گا اب تو یہ بھی واضح ہو گیا ہے کہ وہ ہرگز نہیں آئیں گے۔

تمھارے ابو کا خیال ہے کہ اب وہ جلد کوئی اچھا گھر دیکھ کر تمھارے ہاتھ پیلے کر دیں گے۔ ابھی وہ کچھ کہہ بھی نہ پائی تھی کہ امی اُس کے ماتھے پر پیار دے کر ابو کے لئے چائے بنانے کا بہانہ کر کے کمرے سے چلی گئیں۔

اگلے چند دِنوں کے تصور سے ہی اُس نے بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلا، اِدھر عارف اُس کے شانے پر ہاتھ رکھے اُسے جھنجھوڑ رہا تھا کیا ہوا بھئی ایک دِن ہم تھوڑا جلدی کیا آ گئے جاگتی آنکھوں سے بھی خواب دیکھنے لگی کیا۔

اُس نے عارف کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا کچھ نہیں، بیٹھیں ناں آپ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔
عارف اپنی کرسی پر بیٹھ کر سر پیچھے ڈھلکا کر ایک بار پھر گیلے بالوں کو تولیے سے خشک کرنے لگا نجمہ نے ایک بھرپور نگاہ عارف کے کشادہ سینے پر ڈالی، عارف کے

بازوؤں کی مچلتی ہوئی مچھلیوں اور گردن پر ڈھلکتے ہوئے پانی کے قطروں نے اُس کے سینے میں ایک آگ سی لگادی وہ دِل ہی دِل میں اپنی پیار بھری پر سکون زندگی پر خدا کا شکر ادا کرنے لگی۔

اچانک دونوں کی نظریں چار ہو گئیں، عارف نے مصنوعی بوکھلاہٹ کے ساتھ تولیہ سینے پر ڈالتے شریر نظروں سے نجمہ کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی میں کہا توبہ ہے زمانہ واقعی بدل گیا ہے اب تو مردوں کو بھی اپنے عزت بچانے کے لئے پردہ کرنا شروع کر دینا چاہئے۔

نجمہ نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔۔۔ عارف آپ بھی ناں۔۔۔ وقت دیکھتے ہیں نہ جگہ۔۔۔۔

اچھا جی اب الزام بھی مجھ پر۔۔۔ اچھا خود ہی بتا دو کون سا وقت اور کون سی جگہ دیکھا کروں۔۔۔ یہ کہتے ہوئے عارف تولیہ دروازے پر ڈالنے کے لئے اٹھا نجمہ کو لگا وہ اُس کی طرف آنے کے لئے اٹھا تھا، وہ کرسی نیچے گرا کر بھاگ کر کمرے میں چلی گئے عارف بھی اُس کے پیچھے بھاگا۔

عارف جو بچوں کی غیر موجودگی، خلاف معمول جلدی گھر آجانے اور نہا دھو کر فریش ہونے کو مشکل سے برداشت کر رہا تھا نے ایک ہی جست میں نجمہ کو جا پکڑا اور بازؤوں پر اٹھا کر بیڈ ر دے مارا۔

اچانک پیاسی زمین پر موٹی موٹی بوندیں پڑنا شروع ہو جائیں تو مٹی سے بے ساختہ سوندھی سوندھی باس اُٹھے لگتی ہے۔۔۔ نجمہ کا تن من بھی خوشبو اُڑانے لگا۔

امی جی سلام علیکم، امی سلام علیکم اچانک مہ نور اور صفدر کی توتلی اور چہکتی آوازوں نے سارے سحر سارے طلسم اور ساری بو باس کو کافور کر دیا، بجلی کی سی تیزی سے سب کچھ ٹھیک ٹھاک کیا گیا۔۔۔ ارے بابا آپ۔۔۔ واہ اللہ میاں کتنے اچھے ہیں۔ میں آج ہی دعا کر رہا تھا کہ آج میں گھر پہنچوں تو میرے بابا آگئے ہوں۔

مہ نور بھاگتی ہوئی سیپارے سمیت آ کر اپنے بابا کی ٹانگوں سے لپٹ گئی، صفدر بڑا ہونے کا ثبوت اکثر صبر کی صورت میں دیا کرتا تھا وہ مہ نور کے بابا کو چھوڑنے کا انتظار کرنے لگا۔

عارف نے مہ نور کو دھیرے سے ایک ٹانگ کے ساتھ کیا اور پھر صفدر کو آگے آنے کا اشارہ کر کے دونوں کو سینے سے لگا لیا۔ اُس کے جگر کے ٹکڑے اُس کے ساتھ پیوست تھے اور اُس کی نگاہیں نجمہ کے خوشی سے دمکتے چہرے پر مرکوز تھیں۔

بابا آج آپ شام کو ہی گھر آ گئے ہیں کیا ہمیں پارک میں لے جائیں گے ، صفدر نے فرمائش کی، ہاں بیٹا ضرور جائیں گے بس تم لوگ منہ ہاتھ دھو کر پیڑے بدل لو اور تمھاری امی بھی تیار ہو جائیں تو چلیں گے۔

بابا آج آپ جلدی کیسے آ گئے ہیں روزانہ تو آپ اُس وقت آتے ہیں جب ٹی وی ڈرامہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور ہم سونے والے ہوتے ہیں بیٹا آج ہمارے ساتھ والی دوکان کے مالک حاجی صاحب فوت ہو گئے ہیں سب اپنی اپنی دوکانیں بند کر کے اُن کے جنازے میں گئے تھے اور پھر ہم لوگ وہاں سے گھر آ گئے، عارف نے نجمہ کی طرف منہ کر کے بچوں کے ساتھ ساتھ اُسے بھی اپنے جلد آنے کی وجہ بتائی۔

وہ لوگ گھوم پھر کر رات کو کافی دیر سے گھر پہنچے کھانا وغیرہ باہر سے ہی کھا کر آئے تھے، لہٰذا بستر پر گرتے ہی سو گئے۔

اگلے دِن عارف سٹور سے آیا تو نجمہ سے بولا، کل صبح حاجی صاحب کے سوئم کی دعا ہے مجھے صبح یاد کرا دینا ذرا دیر سے نکلوں گا اور پہلے اُن کے ہاں سے ہو کر پھر سٹور پر جاؤں گا، نجمہ نے ہر ضروری بات کی طرح اِسے اپنے حافظے میں بٹھا لیا، صبح عارف نے سفید کاٹن کا جوڑا پہنا، بچے سکول جا چکے تھے، اُسے ساڑے دس بجے گھر سے نکلنا تھا تا کہ گیارہ بجے حاجی صاحب کے ہاں دعا میں شامل ہو کر سٹور جائے۔ عارف

نجمہ کو خدا حافظ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا تو نجمہ نے اُسے پکڑ کر دیوار کی اوٹ میں کر لیا، اپنی آنکھ سے انگلی پر تھوڑا کاجل لگا کر نجمہ نے عارف کی گردن پر لگا یا اور پھر اُس کی گردن میں باہیں ڈال کر اُسے زبردستی اپنے ساتھ بھینچ کر اُس کی ٹھوڑی پر دھیرے سے کاٹ دیا۔ یہ کیا ہے بھئی؟ عارف نے نجمہ کو پیار سے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔ نشانیاں لگا دوں ناں آپ کو۔ایک بد نظر سے بچنے کے لئے اور دوسری نظر ملانے سے بچانے کے لئے۔

عارف نے نجمہ کی ناک کو دو انگلیوں کے درمیان پکڑ کر زور سے دبایا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

(۲)

حاجی صاحب کی دُعا میں خاصے لوگ تھے نعت خواں پارٹی بھی تھی اور چند لوگ تبلیغی دورے سے ہو کر واپس آئے تھے وہ بھی شریک تھے۔ اُن لوگوں نے حاضرینِ محفل کو اپنی دلچسپ سفری روداد سنائی، لوگ اُن کی باتیں بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے اور ساتھ ساتھ وہ گھڑیاں، موبائل فون اور انگوٹھیاں بھی دیکھ رہے تھے جو شاید وہ بیرون ممالک سے لائے تھے مگر اُن کا ذکر نہیں کر رہے تھے۔

دو صاحبان جن کی داڑھیاں غیر معمولی لمبی تھیں عارف کے بالکل ساتھ ہی دائیں بائیں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ عارف سے باتیں کرنے لگے۔ عارف ان کی باتیں سنتا رہا مگر اُس کی نظریں کبھی اُن کی آدھی شلواروں پر جن میں سے اُن کی آدھی ننگی سوکھی سوکھی ٹانگیں بہت واہیات لگ رہی تھیں اور کبھی اُن کی جیبوں کے ساتھ بنی نالی دار نیفا نما اضافی جیبوں پر ٹِک جاتیں، جن میں مسواکیں ٹھونسی ہوئی تھیں، اُن میں سے ایک شخص کی مسواک کے منہ پر دو مکھیاں بہت دیر سے بھنبھنا رہی تھیں جو عارف کو بہت ذہنی کوفت دے رہی تھیں جب کہ دوسرے کی مسواک پر شاید منہ کی رطوبت لگی ہوئی تھی جس پر گرد کی تہہ بیٹھ رہی تھی۔

دونوں نے عارف کو بہت سی تلقین کی کہ وہ اُن سے رابطے میں رہے اور اپنی دنیا داری میں سے تھوڑا سا وقت راہِ خدا کے لئے لازما نکالا کرے۔عارف اُن سے وعدہ کر کے سٹور پر چلا گیا۔

آج سٹور پر اُس کا دِل کچھ مضطرب سا رہا دو تین بار اُس نے کام چھوڑ کر چند لمحے توقف کر کے کچھ سوچا اور پھر سر جھٹک کر دوبارہ کام میں مشغول ہو گیا، شام کو گھر آ کر اُس نے نجمہ سے ذکر کیا،

آج حاجی صاحب کے سوئم پر کچھ لوگوں سے ملاقات ہوئی وہ لوگ جو کچھ بتاتے ہیں نجمہ۔۔۔اُس کے مطابق تو ہم سب جہنم میں جائیں گے۔

قبر کے عذاب ہی ختم نہیں ہونگے ہزاروں سالوں تک اور پھر قیامت کا ہزاروں سال کا دِن اور اُس کے بعد دوزخ ،اور پھر نا محرم پر نظر ڈالنے والے کی تو آنکھوں میں لوہے کی گرم سلاخیں لگائی جائیں گی۔۔۔عارف نے ایک جھر جھری لے کر کہا۔

خوف اُس کے چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں شے تھی۔

نجمہ ہنس پڑی، کیا کر رہے ہیں آپ؟ خدا ہم سے سات ماؤں جتنا پیار بھی تو کرتا ہے،اور ہم کون سا کوئی گناہ کی زندگی گزار رہے ہیں۔۔۔

نہیں نجمہ نہیں، اُن آدمیوں میں سے ایک عالم صاحب کہہ رہے تھے کہ یہی سوچ تو جہنم کا دروازہ ہے اور تم نے تو پہلے دِن ہی اُن کی بات سچ کر دکھائی، وہ کہہ رہے تھے سب سے پہلے شیطان تمھارے اپنوں کے روپ میں آ کر تمھیں اِس راہ پر چلنے سے روکے گا۔ اُس نے پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے نجمہ کو پیچھے کیا۔

نجمہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹی۔ مزاح میں کی گئی بات میں سنجیدگی کا میل ملتے ہی اُسے شدید احساسِ ذلت ہوا۔

اِس ایک بات نے۔۔۔ عارف کے اندر کی اِس بُو نے اُسے جس احساس سے سب سے پہلے متعارف کرایا وہ ایک سوکن کے وجود کی بو کا سا احساس تھا۔۔۔ بے نکاحی سوکن۔

دروازے پر دستک ہوئی عارف دیکھنے گیا اور دروازے سے منہ اندر کر کے گلی میں ایک آدمی سے مل آنے کا کہہ کر باہر چلا گیا۔ نجمہ نے چند لمحے عجیب سی بے چینی محسوس کی اور پھر کام میں مصروف ہو گئی۔

چند دِنوں سے عارف کچھ بجھا بجھا سا رہنے لگا تھا اُس کی بے باکی اور والہانہ پن میں کچھ پھیکا پن سا آ گیا تھا ایک دو بار تو اُس نے بچوں کو باہر لے جانے سے بھی احتراز سا کیا۔ کبھی وہ مُنیٔ کو ٹی وی کے سامنے بیٹھا دیکھتا تو ایک پریشان سی سوچ میں گم ہو جاتا، کبھی صفدر کو کسی بچے سے کھیلتا دیکھتا تو غصے میں آجاتا۔

آج عارف جب سٹور سے واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں چند کتابیں تھیں نجمہ نے سمجھا شاید بچوں کے لئے کچھ کہانیوں کی کتابیں آئی ہیں کیونکہ عارف کو کتابوں یا مطالعے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ اگر کبھی نجمہ کی کوئی کتاب اٹھاتا بھی تو ایک دو صفحے پڑھ کر اُسے کہتا تم پڑھو اور خود آنکھیں بند کر کے پاس لیٹ کر سننے لگتا دو ایک صفحات کے بعد عارف کے خراٹے نجمہ کی کتاب بند کرا دیتے۔
نجمہ نے آگے بڑھ کر کتابیں عارف کے ہاتھ سے لینا چاہیں تو اُس نے کہا ہاتھ بالکل صاف ہیں ناں۔۔۔ جی جی ابھی کھانا بنا کر فارغ ہوئی ہوں اور ویسے بھی صاف ہوں، عارف نے کتابیں نجمہ کے ہاتھ میں دے دیں اور خود باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ عارف نے گزشتہ ہفتے سے باقاعدگی سے نماز شروع کر دی تھی اور نجمہ کو معلوم تھا کہ اب وہ وضو کر کے نمازِ عشاء ادا کر کے ہی بات چیت کرے گا۔ وہ کتابیں دیکھنا شروع ہو گئی۔
رات عارف کافی دیر تک ایک دو کتابوں کے مختلف صفحات پڑھتا رہا، آج عارف نجمہ کے ساتھ ٹی وی کا کوئی پروگرام بھی نہ دیکھ سکا اور چونکہ نجمہ کافی دیر کروٹیں بدل بدل کر سو گئی اِس لئے وہ اُسے سوتے وقت کا بوسہ بھی نہ دے سکا۔
رات کو مطالعہ کرنا اور ٹی وی ڈرامہ چھوڑنا عارف کا معمول بن گیا نجمہ نے محسوس کیا کہ اب عارف بچوں کو باہر لے جانے سے واضح کترانا شروع ہو گیا ہے اور آج تو جب بچوں نے بہت ضد کی تو وہ تیار تو ہو گیا مگر نجمہ نے جب پوچھا میں کیا پہنوں تو بولا تم رہنے دو میں ابھی انھیں گھما کر لاتا ہوں نجمہ حیران رہ گئی وہ اُس کے بغیر کبھی تفریح کے لئے اکیلا نہیں گیا تھا۔

رفتہ رفتہ عارف کی کتابوں میں اضافہ ہونے لگا، اُس کے مطالعے کا شوق بھی بڑھنے لگا اور اب اکثر ان لوگوں کی محفل میں بھی جایا کرتا تھا جنہوں نے اُسے اِس راہ پر لگایا تھا۔ بچوں کو باہر لے جانا بہت کم ہو گیا اور نجمہ تو پچھلے تیس دِن سے باہر گئی ہی نہیں تھی، عارف نے کہا نہیں اور نجمہ نے کبھی اظہار نہیں کیا۔

دِن کو عارف کے سٹور پر ہونے کی وجہ سے کوئی فرق محسوس نہ ہوتا مگر رات کو گھر کے ماحول کا فرق واضح محسوس ہونے لگا تھا۔

ایک دِن نجمہ نے عارف کے شانے پر ہاتھ رکھا اور دھیرے سے بولی یہ کتاب بند کر دیں بہت دیر ہو چکی ہے اور جناب ایک دو ورق ہمارے بھی کبھی پڑھ لیا کریں، کسی کتاب کو بہت عرصہ بند رکھیں تو اُس کے لفظوں کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ عارف نے دھیرے سے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا اور اُسے سینے سے لگا لیا کوئی ایک گھنٹے بعد جب عارف نجمہ کو سونے کا کہہ کر باتھ روم کی طرف گیا تو نجمہ دوسری طرف مڑ کر سونے کی کوشش کرنے لگی، مگر آنکھیں جتنی بھی موٹی اور گہری ہوں اُن میں ایک وقت میں ایک ہی چیز سما سکتی ہے یا خواب یا آنسو۔ آج نجمہ کو کھل کر احساس ہوا کہ سب کچھ بدل چکا ہے۔ بچوں پر پابندی، ٹی وی سے بیزاری کتابوں کی طرف غیر معمولی جھکاؤ اور عارف کی طبیعت میں پژمردگی کو وہ کبھی تھکاوٹ اور کبھی ذہنی ہیجان کا نام دے کر اپنے آپ کو تسلی دیتی رہتی تھی مگر آج سارے جنون، والہانہ پن اور جوالا مکھی کے بدلے ایک میکانکی عمل کی ادائیگی نے ایک طاہر وطیب وجود

کے ایک اسفل و گندے وجود سے ملاپ کے احساس نے اُس کو توڑ کر رکھ دیا وہ عارف کے گھر میں آج پہلی باراِس طرح روئی تھی اوراِس گھر میں اُس کے دِل میں جدائی کا خوف بھی آج پہلی بار داخل ہوا تھا۔

گزرتے ہوئے دِنوں نے حالات کی سنگینی کو کم کرنے کی بجائے بڑھاوادیناشروع کر دیا۔بچے ہری شاخیں ہونے کی وجہ سے کچھ دِن چڑچڑے اور بے زار ہوئے مگر پھر عادی سے ہونے لگے البتہ اُن کی بے ساختہ ہنسی، شرارتیں اور ضدیں معدوم ہونے لگیں۔ عارف نے ایک ایک چیز کو دو دو بار دھونااور پر کھنا شروع کر دیا، وہ کھل کر ہنسنا، کھیلنا، مذاق کرنااور بیوی بچوں کو باہر لے جانا بھول گیا مگر نجمہ کو اِن سب باتوں میں سب سے زیادہ پریشان یہ بات کر رہی تھی کہ اُس کا احساسِ ذلت شدید تر ہوتا جارہا تھا۔وہ اکثر اپنے آپ سے نفرت کے احساس سے دوچار ہو جاتی وہ بہت کچھ کہنااور سننا چاہتی، لڑنا چاہتی تھی، بحث کرنا چاہتی تھی۔۔۔ مگر کس سے۔ کبھی اُسے کھلکھلا کر قہقہ لگانے کی عادت تھی اور عارف اکثر اُسے کہا کرتا تھا جس دِن گلی میں کسی نے تمھارے ہنسنے کا آواز سن لی وہ پھر یہاں سے جائے گا نہیں یہیں ڈیرے لگالے گا۔ وہ چپ ہو جاتی مگر کچھ دیر بعد پھر بھول جاتی اور قہقہ لگا دیتی۔ لیکن اب وہ اکثر ایسا محسوس کرتی کی کہ اُسے زور زور سے رونے کا ایک ارمان سا ہے۔

وہ دیکھ رہی تھی کہ عارف اپنی ذات کا اعتماد کھو رہا ہے۔ عارف ہر شے کو اچھائی، برائی، گناہ ثواب، گندی صاف اور چند لوگوں کی بتائی باتوں کے آئینے میں ہی دیکھنے لگا ہے۔اُس نے کئی بار عارف سے بات کرنی چاہی مگر ایک دو بار کی بے رخی اور

بات بات پر حوالوں نے اُس کی انا کو ٹھیس پہنچائی سو اب وہ خود سے نہیں کہنا چاہ رہی تھی، وہ اکثر دعا کرتی کہ اُس کا گھر پہلے جیسا ہو جائے مگر پھر دعا کرتے کرتے چپ ہو جاتی اور اپنے خدا سے لڑنا شروع کر دیتی۔

کبھی کبھی نجمہ کا دِل چاہتا کہ وہ ابو سے ملے اور اُن کے گلے لگ کے خوب روئے یا امی کی قبر کو سینے سے لگا کر ساری باتیں اُس سے کرے مگر پھر دوسری ماں کا خیال آتے ہی اُسے گھن سی آنے لگتی۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ وہ اپنی سگی ماں سے بھی اپنے گھر یا اپنے خاوند کے بارے میں کوئی منفی بات کرے چہ جائیکہ دوسری عورت کے سامنے وہ اِس طرح کی بات کرے۔ یہ اُس کے لئے ناممکن تھا۔ ابو کا خیال آتے ہی وہ گزرے دِنوں کی یادوں میں کھو جاتی، اُسے کل کی طرح یاد تھا جب ابو امی اُسے کراچی سے آئے ابو کے ایک دوست کے بیٹے کے رشتے کے لئے اُسے راضی کرنے کی کوشش کرتے تھے کبھی امی اُسے پیار سے سمجھاتیں اور کبھی ابو اُس کو سنانے کے لئے اپنے کمرے میں امی کو ڈانٹتے، انہی دِنوں اُس کا تعلیمی سال مکمل ہوا تھا اور وہ گھر میں ہونے کی وجہ سے بہت پریشان تھی کیونکہ یونیورسٹی میں تو پھر بھی ہفتے میں ایک آدھ بار عارف کو فون کر لیتی تھی۔ ایک دِن اُس کی ایک سہیلی اُس کے پاس آئی اور بتایا کہ عارف کا فون آیا تھا اور ابھی کچھ دیر بعد اِس موبائل پر فون کرے گا تم بات کر لو اُس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

عارف نے اُسے بتایا کہ میری ضد کی وجہ سے ابو نے مجھے کاروبار کے لئے میرا حصہ دے کر الگ کر دیا ہے اور اپنے طور پر شادی کی اجازت دیتے ہوئے مجھ سے قطع

تعلقی کر لی ہے لہٰذا میں کچھ دِنوں بعد راولپنڈی ہی آ رہا ہوں اور وہیں اپنی رہائش رکھوں گا اور خود تمھارے ابو امی کی منت سماجت کر کے رشتہ مانگ لوں گا۔ شادی ہو گئی تو کچھ عرصے بعد لاہور واپس آ کر اپنے ابو امی کو بھی راضی کر لیں گے۔

عارف کے آنے کے بعد بھی نجمہ کے ابو راضی نہ ہوئے تھے۔ پھر نجمہ کی امی کے یرقان بگڑ جانے اور اُسی وجہ سے فوتگی نے نجمہ کی زندگی کو جیسے ہلا کر رکھ دیا وہ پہلے ہی اکیلی تھی مگر اب تو آنسو پونچھنے والا بھی کوئی نہ بچا تھا سوائے عارف کے۔ امی کی موت کے تیسرے مہینے جب نجمہ کے ابو نے خود عارف کو گھر بلایا تو وہ امی کے غم کو عارف کے سہارے سہنے کا سوچنے لگی اور ابو کی اِس مہربانی پر دِل ہی دِل میں دن رات انھیں دعائیں دیتی رہتی مگر جب نجمہ کی عارف کے ساتھ رخصتی کے پندرہ دِن بعد ہی نجمہ کے ابو نے دوسری شادی کر لی تو جیسے نجمہ نے اپنا جذباتی رشتہ صرف اپنی ماں کی قبر تک محدود کر لیا اور اُسی کو اپنا میکہ سمجھنے لگی، وہ کبھی بھی ابو سے عارف کی شکایت یا اپنی تکلیف بیان نہیں کر سکتی تھی۔

آج صبح عارف مخصوص انداز میں سلوایا ہوا وہ سفید کرتا پہن کر سٹور گیا تھا جو اُسے نئے بننے والے دوستوں نے دیا تھا اُس نے کپڑے پہننے کے بعد بہت تیز اور بہت زیادہ مقدار میں عطر بھی لگایا، کُرتے کی جیب کے ساتھ ایک پتلی اور لمبی سی اضافی جیب بھی تھی جو کہ ابھی خالی تھی نجمہ نے عارف سے پوچھنا چاہا کہ یہ کس مقصد کے لئے ہے مگر پھر خاموش رہ گئی، وہ رات کی بے رخی، جسے وہ بے رخی کی بجائے ذلت کا نام دیتی جا رہی تھی کی وجہ سے عارف سے ناراض تھی عارف نے چپل کی بجائے سلیپر پہنے بالوں پر خاصی مقدار میں تیل لگایا اور اپنے آپ کو آئینے میں دیکھنے

لگا نجمہ حیران تھی کہ عارف کے خوش پوشی کے ذوق کو آئینے کے سامنے جا کر کتنا بڑا دھچکا لگے گا مگر عارف آئینے کے سامنے جا کر ایک لمحے کے لئے ذرا سا ٹھٹھکا اور پھر ایک نیا خریدا گیا بڑا سا رومال ہاتھ میں پکڑ کر نجمہ کو خدا حافظ کہتا ہوا دروازے کی طرف چل پڑا۔ نجمہ جانتی تھی کہ آج عارف نے اپنے نئے دوستوں کی کسی تقریب میں جانا ہے اور آج وہ دیر سے گھر لوٹے گا آج سارا دِن گھر کے کام کاج بچوں کی مصروفیت حتیٰ کہ دِن کے آرام کے وقت میں بھی سونے کی بجائے نجمہ دِل ہی دِل میں عارف سے لڑتی اور لاشعوری طور پر ایک متوقع مکالمے بلکہ مباحثے کی تیاری کرتی رہی، اُس کے اندر ایک عجیب سی جنگ جاری تھی اپنے ہی خاوند سے جنگ اپنے عارف سے جنگ۔

نجمہ صوم و صلوۃ میں سے ایک کی پابند تو تھی مگر نماز میں کوتاہی ہو جاتی تھی، لیکن جب کوئی پریشانی کوئی مصیبت یا کوئی بڑی خواہش سامنے آتی تو وہ بہت خلوص اور تہہ دِل سے خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنی عاجزی اور حاجت پیش کیا کرتی تھی۔ خدا کے حضور گڑ گڑا کر اپنے عارف کو واپس مانگنے کی نیت سے نجمہ ظہر کی اذان کی آواز کانوں میں پڑتے ہی وضو کے ارادے سے واش بیسن کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ پانی ہاتھوں پر ڈالتے ڈالتے ایک بار پھر سوچ میں ڈوب گئی۔ اُسے عارف کی باتیں یاد آنے لگیں۔ چند ہی لمحوں میں اُسے اپنا وجود گندا سا محسوس ہونے لگا وہ بُڑ بُڑائی جس نے مجھ سے میرا عارف چھینا ہے میں اُسی سے کیوں اُس کی واپسی کی دعا کرنے لگی ہوں۔

اُس نے واش بیسن کا نل بند کیا اور بو جھل سے قدموں سے کمرے کی طرف چل پڑی ایک عجیب سی کشمکش ایک جنگ اُس کے دِل و دماغ میں جاری تھی۔ اُسے عارف کی بجائے خدا پر غصہ آنے لگا، سوچتے سوچتے وہ لرز سی گئی، میں واقعی بُری ہوں میں کیا سوچ رہی ہوں۔۔۔ مگر میں نے کوئی گناہ تو نہیں کیا۔۔۔ پھر یہ احساسِ گناہ کیسا یہ سب کیا ہے اوہ میرے خدا میں ٹوٹ رہی ہوں، کیا میں ایک بوجھ ہوں ۔۔۔ کیا میں واقعی گناہ کا سامان ہوں ۔ اُس نے کرسی پر بیٹھ کر اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ کمرے میں اُس کا دم گھٹنے لگا تو وہ باہر صحن میں آ کر بیٹھ گئی۔ بچوں کو اٹھا کر منہ ہاتھ دھلانا اور سیپارہ پڑھنے بھیجنا اُس کے لئے گھر کا سب سے سہل اور تسکین بخش کام تھا مگر آج نجانے کیوں یہ بھی ایک پہاڑ سر کرنے کے ایسا لگ رہا تھا۔ بو جھل قدموں اور بکھرے ہوئے ذہن کے ساتھ اُس نے مہ نور اور صفدر کو جگایا اور واجبی سا تیار کر کے سیپارے کے لئے بھیج دیا۔

بچے گھر میں سو رہے تھے اور جاگ بھی رہے ہوتے تو شرارت اور شور شرابے کے سِوا اُن کا اور کام کیا ہوتا ہے، وہ کون سا مجھے مشورے دیتے ہیں مگر اُن کے جانے سے آج گھر کتنا خالی خالی اور وحشت ناک سا ہو گیا ہے۔ آج امی بھی بہت یاد آ رہی ہیں رات عارف سے پوچھوں گی اور صبح سکول سے آنے پر بچوں کو لے کر امی کی قبر پر ضرور جاؤں گی۔ اُس نے صحن میں بیٹھے بیٹھے کل کا پروگرام بنایا، امی کی یاد نے اُسے کچھ سکون سا دیا وہ اٹھی اور باتھ روم میں جا کر نہانے لگی شاید طبیعت ہلکی ہو

جائے اور کھانے پینے کے لئے بھی کچھ بنا سکوں، نہا کر صحن میں کرسی پر بیٹھی بال خشک کرتے ہوئے نجمہ کچھ تازہ دم محسوس کرنے لگی اُس نے بالوں کو کرسی کے پیچھے گرایا دوپٹہ اور تولیہ اٹھا کر کرسی کے بازو پر لٹکایا اور تپائی پر ٹانگیں لمبی کر کے آنکھیں بند کر کے سر پیچھے کو ڈھلکا دیا۔ لمبی لمبی سانسیں لے کر وہ اپنے دِل و دماغ کو تمام سوچوں سے خالی کرنا چاہتی تھی۔ گیلے بال، سر پیچھے ڈھلکانے کی وجہ سے صراحی کی طرح جام پر جھکی ہوئی گردن اور دوپٹے سے بے نیاز کھلا گلا جو لمبی سانسوں کی وجہ سے سینے کے نشیب و فراز واضح کر رہا تھا مل کر اُسے نجمہ سے ایک توبہ شکن کافرہ بنا رہے تھے۔

(۳)

آپ بالکل بے خبری میں ہوں اور کوئی آپ کو چھپ کر دیکھ رہا ہو، حتیٰ کہ کسی روزن سے بھی نظریں آپ کی چوری کریں تو آپ کو یکدم ایک انجانا سا احساس گھیر لیتا ہے یہ احساس عورتوں میں زیادہ واضح ہوتا ہے ، حالانکہ آپ درودیوار کے پردے میں مستور ہوتے ہیں مگر ایک غیر مرئی سا عدم تحفظ کا احساس فوراً آپ کو غیر محفوظ ہونے کی تنبیہ کرنا شروع کر دیتا ہے، یکدم نجمہ کو بھی ایسا ہی جھٹکا لگا اُسے محسوس ہوا جیسے دو آنکھیں اُس کے جسم کے حصار میں گھس رہی ہیں اور چوری چھپے سارے درودیوار کا جائزہ لے رہی ہیں۔ اُس نے آنکھیں کھولنے سے پہلے کرسی کے بازو پر ہاتھ پھیرا اور تولیے کو سینے پر ڈالتے ہوئے جلدی سے اُٹھ بیٹھی۔ برآمدے میں سے سامنے نظر آنے والے ملک صاحب کے مکان سے پچھلے مکان کے عقبی ٹیرس پر ایک نوجوان اُسے بڑے انہماک سے دیکھے جا رہا تھا، وہ اِسے اپنا وہم سمجھی مگر ادھر اُدھر چیزیں سمیٹنے کے انداز میں توجہ تقسیم کرنے کے بعد جب اُس نے احتیاط سے پھر اُس ٹیرس کی طرف نظر اٹھائی تو وہ مسکرا رہا تھا وہ جلدی سے اٹھی اور کمرے کے اندر چلی گئی۔ وہ کچھ مضطرب سی ہو گئی تھی۔

اُسے ایسی حرکات کرنے والوں سے تو شدید نفرت تھی ہی مگر اپنی ذات کسی ایسی حرکت سے یکطرفہ طور پر بھی منسوب ہونے سے وہ اِس قدر خوف زدہ تھی کہ

اکثر ایسے اتفاق سے بچنے کے لئے وہ دعا کیا کرتی تھی۔ ابھی وہ سنبھلنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ دروازے پر بچوں کی دستک سنائی دی، اُس نے دِل ہی دِل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ بچے واپس آ گئے ہیں اور جلدی سے دروازہ کھولنے کمرے سے باہر نکلی برآمدے سے نکلتے وقت غیر ارادی طور پر اُسکی نظر اوپر اٹھی گئی وہ شخص اُسے دوبارہ اپنی طرف دیکھتے ہی فتح کے انداز میں ہاتھ ہوا میں بلند کر کے پیچھے ہو گیا۔ نجمہ سٹپٹا کر رہ گئی۔ بچوں کو اندر لا کر وہ کمرے میں ہی بیٹھ کر اُن سے سبق کے بارے میں باتیں کرنا شروع ہو گئی۔ کچھ دیر بعد کال بیل کی آواز آئی وہ حیرت سے گھڑی کی طرف دیکھ کر دروازے کی طرف جانے لگی۔ ابھی وہ دروازے سے دو چار قدم پیچھے ہی تھی کہ دونوں کواڑوں کے درمیان سے ایک اخبار کا تہہ شدہ صفحہ اندر نمودار ہوا اُس نے حیرت سے اخبار کے ورق کو پکڑتے ہوئے دروازہ کھولا باہر کوئی بھی نہیں تھا کمال ہے ہمارے ہاں تو اخبار نہیں آتا اور پھر یہ کون سا وقت ہے اخبار پھینکنے کا۔ لیکن یہ تو اخبار کا ایک ورق ہے پورا اخبار بھی نہیں ہے۔ نجمہ نے وہ ورق کھول کر دیکھنا چاہا کسی دو دِن پہلے کے اخبار کا ایک حصہ تھا۔ اچانک اُس کی نظر اخبار کی پیشانی کے سادہ حاشیئے پر پڑی بال پوائنٹ پین سے دِل بنا ہوا تھا جس میں شکریہ لکھا ہوا تھا اور ساتھ ایک موبائل نمبر موٹے موٹے حروف میں درج تھا۔ نجمہ کا مارے غصے کے بُرا حال ہو گیا اُس نے اخبار ایک طرف پھینک دیا اور پاؤں پٹختی ہوئی۔ بچوں کے پاس چلی گئی۔ اُس نے محسوس کیا کہ اِس نئی الجھن نے اُس کی تمام تر توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی کچھ دیر کے لئے وہ عارف کی تبدیلی، اپنی پریشانی اور وہ ذلت کا احساس سب بھول گئی تھی۔ رات کو عارف کے آنے سے کچھ

دیر پہلے نجانے کیوں نجمہ کو اُس اخبار کے ورق کا خیال آیا۔ کچھ دِن پہلے ایسا ہونے کا کوئی امکان نہ تھا مگر اُسے لگا کہ اب اگر عارف نے صحن سے گزرتے ہوئے وہ ورق اٹھا لیا یا اُس نے خود بھی عارف سے اُس واقع کا ذکر کر دیا تو ایک طوفان آجائے گا عارف کے بے نام الزام اور خوف کو ایک نام مل جائے گا۔ نجمہ صحن میں آئی اور اخبار کا ورق اٹھا کر کچن کی الماری کے پیچھے پھینک دیا۔

اگلی صبح جب نجمہ جاگی تو اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے سینے میں کچھ گھٹن سی ہے، دِن بھر وہ مضمحل طبیعت کو سنبھالتی رہی اُسے لگ رہا تھا جیسے سینے کے بیچوں بیچ ایک دیوار سی کھڑی ہو گئی ہے جس نے سینے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اُس نے عارف سے ذکر کیا تو وہ بولا اچھا ایک دو دِنوں میں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا ویسے اگر میری مانو تو اِس سینے میں کچھ خدا کا نور بھی جانے دو کبھی کوئی ذکر اذکار ہی کر لیتا ہے انسان، ساری بیماریاں اِسی دنیاداری سے ہیں اور تمھارے سینے میں تو ہے ہی دنیا داری۔ عارف یہ بات کر کے سٹور چلا گیا اور نجمہ کو جیسے کسی نے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا ہو اُسے عارف سے اپنی تکلیف کا ذکر کرنے پر افسوس ہو رہا تھا۔
اگلے بہت سے دن نہ تو نجمہ عارف سے کھل کر کوئی بات کر سکی اور نہ اپنی بے چینی ختم کر سکی۔

وہ دو حصوں میں تقسیم نہیں ہونا چاہتی تھی، عارف سے بات کرنا چاہتی تھی مگر وہ غیریت کی دیوار وہ ذلت کا احساس

اور وہ دِل میں مچلتی ہوئی تڑپ کہ عارف خود مجھے سینے سے لگا کر پوچھے

نجو کیا بات ہے کچھ دِن سے بڑی اداس ہو؟

امی یاد آ رہی ہیں یا کوئی فرمائش پوری کرانی ہے؟

مگر عارف تو جیسے ہنسنا کھیلنا، گھومنا گھمانا، مستی شرارت دیوانگی سب بھول چکا تھا۔ عارف علی الصبح نماز کے لئے مسجد جاتا اور ناشتے کے وقت واپس آتا ناشتہ کرتے ہی سٹور کے لئے نکل جاتا اور رات گئے واپس لوٹتا، نجمہ بہت تنہا ہوتی جا رہی تھی۔ بچوں کی موجودگی میں پھر طبیعت بہلی رہتی تھی مگر جب وہ بھی نہ ہوں تو پھر تو وحشت ناک سناٹا ہو جاتا ہے وہ آئینے کے سامنے کھڑی بال بنا رہی تھی اور اپنے چہرے پر صرف دو تین ماہ میں پڑنے والے اثرات کو دیکھ کر حیران تھی اچانک اُسے گزشتہ رات کی بات یاد آئی جب عارف نے اُسے اُس کے ماں کی قبر پر جانے کے بارے میں پوچھنے پر کہا، یہ سب خرافات ہیں قبروں پر جانا اور سالانوں کے نام پر فضول خرچی کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ آئینے کے سامنے کھڑے کھڑے بے بسی سے اُس کے آنسو نکل آئے۔ نجمہ گزشتہ ہفتہ بھر سے شام کو تو دور دِن کے تنہا اوقات میں بھی صحن میں نہ نکلتی تھی اُسے گزشتہ ہفتے کی بھونڈی حرکت نے بہت پریشان کیا تھا۔۔۔۔ لیکن اِس وقت تو وہ چھت پر نہیں ہو گا ابھی تو دوپہر کا وقت ہے اور اگر ہو بھی تو یہاں تو میرا دم گھٹنے لگا ہے باہر کم سے کم سانس پر تو پابندی نہیں ہو گی۔ وہ آہستہ آہستہ برامدے میں آئی اور سامنے ٹیرس خالی دیکھ کر سکون کی سانس لیتے ہوئے کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔

کیا سے کیا ہو گیا چند دِنوں میں؟

میرے ہنستے بستے گھر کو کس کی نظر لگ گئی؟

میں کس سے شکوہ کروں کس کا دامن پکڑوں؟

میرا کیا قصور ہے؟۔

عارف کے نئے دوستوں کا سب کیچ دھرا ہے؟

مگر اُن کا بھی کیا قصور، قصور تو میرے اپنے عارف کا ہے؟

نہیں عارف بے قصور ہے، قصور اُس نیلی چھتری والے کا ہے جس کے نام پر سب کچھ ہو رہا ہے!!!

اور وہ اوپر بیٹھا میرا گھر اجڑتا دیکھ رہا ہے میرا دم گھٹ جائے گا یہ ذلت کا احساس مجھے مار ڈالے گا۔

یہ تنہائی مجھے کھا ہی تو لے گی پہلے ماں گئی پھر باپ نے منہ پھیرا اوہ خدایا کیا اب میرا عارف بھی گیا۔

کاش عارف کے امی ابو عارف سے راضی ہوتے اور مجھے قبول کیا ہوتا تو میں آج اُن کی مدد لے لیتی، مگر وہ کیا مدد کرتے عارف انھیں بھی دنیادار اور بے خبر کہہ کر چپ کرادیتے، مگر عارف کو اُن کی اپنی بے خبری کون بتائے۔

اوہ میرے خدا، سینے میں گھٹن سر درد سے پھٹا جا رہا ہے اور اب تو کمرے میں جانے سے بھی خوف آنے لگا ہے۔ نجمہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے گھر کے در و دیوار کو دیکھنے لگی، سامنے وہی نوجوان کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا وہ اُس کی طرف دیکھتی رہی وہ کبھی اخبار پڑھنے کی طرح ہوا میں ہاتھوں سے اشارہ کرتا اور کبھی اپنا موبائل فون سامنے کر کے اُس کی طرف انگلی سے اشارہ کرتا۔ نجمہ کا دِل چاہا کہ اپنی بے بسی کا مذاق اُڑانے والے کو کسی بہانے صرف ایک بار گھر بلائے اور اُسے کچا چبا جائے، غصے اور کراہت

کے احساس نے اُس کی تنہائی، بوریت اور ذلت کے احساس کو یکسر کافور کر دیا وہ زخمی شیرنی کی طرح اپنے شکار کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی، اُس کے جسم اور احساسات میں ایک ٹھہراؤایک وزن سا آگیا، وہ سیدھی بیٹھ کر اپنے آپ کو درست کرنے لگی اُدھر لڑکے کی لاابالی اور بے ہودہ حرکات میں بھی ایک طمانیت جھلکنے لگی ۔

نجمہ نے دِل ہی دِل میں پکاارادہ کر لیا کہ وہ اِس نوجوان کو ذلیل کر کے ہی دم لے گی چاہے اِس کے لئے کتنا بڑا رسک ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ لیکن نجمہ کے سینے کے اندر ایک اور نجمہ بیٹھی مسکرا رہی تھی اُسے تو عارف سے انتقام لینا تھا، اِس نئے نوجوان سے نہیں وہ تو اِس انکشاف پر مسرور تھی کہ سہ پہر کے اِن لمحات میں سارے غم بے وزنی کی ساری کیفیت، ذلت کا سارا احساس کافور ہو جاتا ہے اور اُسے اپنا وجود پُر اثر، بامعنی اور اہم لگنے لگتا ہے۔ دروازے پر بچوں نے دستک دی نجمہ فوراً بچوں کے لئے دروازہ کھولنے چل پڑی۔

جوں جوں دِن گزرتے جا رہے تھے نجمہ کی تکلیف میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اب یہ تکلیف دودھاری تلوار کی طرح کاٹ رہی تھی ایک طرف عارف تھا جس کی بے رخی اور ذلت افزائی بڑھتی جا رہی تھی اور نجمہ بالکل بے بس تھی اور دوسری طرف وہ اجنبی شخص، نجمہ کے اندر کی عورت اُسے مجبور کر کے گھسیٹ کے صحن میں لے جاتی تھی کیونکہ اِس سے اُس کو ایک عجیب تسکین محسوس ہونے لگی تھی وہ اِس بات سے محظوظ ہوتی کہ کوئی اُس کی فقط ایک جھلک دیکھنے کے لئے گھنٹوں

دھوپ میں کھڑا رہتا ہے۔ کوئی اُس کی آواز سننے کے لئے اُس سے بات کرنے کے لئے تڑپ رہا ہے۔ نجمہ یہاں بھی بے بس تھی مگر وہ ہار ماننے کو تیار نہ تھی وہ ہمیشہ اپنی انا اور خودداری کو درمیان میں لے آتی اُسے لگتا عارف اُس کے اندر کی عورت سے ملا ہوا ہے اور وہ اُسے گھر سے نکلتے وقت ہاتھ پاؤں باندھ کر اُس عورت کے حوالے کر جاتا ہے۔

رفتہ رفتہ نجمہ اپنے اندر بیٹھی دشمن کی طاقت کی قائل ہونے لگی، مگر اُس کی ساری باتیں سن کر اور اُس کے جواز مان کر آخر میں نجمہ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔

کچھ دِن بعد نجمہ صفدر کے لئے پہلا سیپارہ لینے مارکیٹ تک گئی۔ بچوں کی کتابوں کھلونوں اور تحائف کی دُکان پر کچھ موبائل سیٹ بھی رکھے ہوئے تھے نجمہ نے ادھر اُدھر دھیان رکھ کر سرسری سی نگاہ ایک دو موبائل سیٹوں پر ڈالی اور اُن کی قیمتیں پوچھ کر واپس آگئی۔ آئندہ ہفتے میں نجمہ کی مصروفیات میں دو ایسی دلچسپیوں کا اضافہ ہو چکا تھا جو اُسے پریشانی سے کچھ دیر کے لئے ہی سہی مگر نجات دلانے لگیں ایک تو ٹی وی پر موبائل فون کے اشتہاروں میں دلچسپی اور دوسرے سہ پہر کے وقت برآمدے میں بیٹھ کر چائے پینا۔

(۴)

ایک دِن عارف کافی ساری مزید کتابیں اور کچھ آڈیو کیسٹیں لے آیا۔ نجمہ نے براہ راست تو نہ پوچھا مگر عارف کے سٹور چلے جانے کے بعد وہ اُن اشیاء کو کسی باہر والی کی طرف سے اپنے خاوند کے نام لکھے جانے والے خطوں اور تحفوں کی طرح ٹٹولتی رہتی۔ایک رات عارف نے نجمہ سے کہا میں اِن کتابوں سے تیاری کرنا چاہتا ہوں کچھ دِن بعد میرے نئے دوست میرا ابھی امتحان دلوائیں گے اور پھر میں دستار باندھ کر اُن کے ساتھ دوسرے شہروں میں تعلیم دینے جاسکوں گا۔ نجمہ سے رہا نہ گیا ویسے بھی اپنی ایک حرکت سے زندگی میں ہلچل مچا دینے کی طاقت کے احساس نے اُسے دلیر کر دیا تھا۔ عارف ایک بات کہوں اگر بُرا نہ لگے تو، ہاں کہو کیا بات ہے، عارف یہ سب تو کامیاب زندگی گزارنے کے لئے

ہوتا ہے اور ہماری زندگی تو ماشاءاللہ پہلے ہی آئیڈیل تھی میرا مطلب ہے آئیڈیل ہے تو پھر یہ سب کس لئے عارف نے طنزیہ مسکراہٹ سے نجمہ کی طرف دیکھا، نجمہ یہی تو فرق ہے اچھی اور بُری سوچ میں ہم فقط اپنی زندگی اچھے طریقے سے گزارائیں یا اپنے بچے پال جائیں تو کیا کمال ہوا مزا تو جب ہے کہ ہم بہت سے لوگوں کو اِس راہ پہ لگائیں، پوری دنیا کو بدل ڈالیں۔ کاش تم نے پڑھا ہوتا کہ دوسروں کی دنیا بنانے کے لئے اپنی آخرت تباہ نہ کرو، یہ اپنے اہل خانہ اور اعزاء واقارب کے

بارے میں ہی تو ہے۔ مگر عارف کیا اپنی آخرت سنوارنے کے لئے دوسروں کی دنیا تاریک کرنا درست ہے کیا خوشیوں کے خون کے بغیر کوئی شے اِس پودے کی آبیاری نہیں کر سکتی۔ افوہ بھئی تمھاری باتیں تو پہلے بھی میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں اور اب تو اِن میں شیطان کی دلیلیں بھی شامل ہو گئی ہیں چلو ہٹو میں نے مطالعہ کرنا ہے۔

عارف مطالعے کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا اور نجمہ نے موبائل فون خرید لیا فون خرید کر پہلے دِن تو نجمہ تنہائی کا سارا وقت اُس کے الٹ پُلٹ اور بٹنوں سے مغز ماری کرتی رہی، یونیورسٹی کے دِنوں میں موبائل فون اتنا شاذ و نادر تھا کہ شاید پورے کالج میں ایک یا دو لڑکیوں کے پاس تھا اور اتنا مہنگا تھا کہ نجمہ اُسے ہیرے کے سیٹ کی طرح فقط دکانوں کے شوکیسوں یا فلموں اور ڈراموں میں زیب دینے والی شے سمجھتی تھی، پھر کچھ سہیلیوں نے خریدا اور نجمہ نے بمشکل دو تین بار عارف سے ہی بات کی وہ بھی سہیلی کے بات کرانے پر پچھلے سال جب عارف نے موبائل فون خریدا تو نجمہ کو فقط اتنا ہی معلوم تھا کہ فون کیسے سنتے ہیں اور کیسے بند کرتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ نیا نمبر کیسے محفوظ کرتے ہیں اور ایس ایم ایس بھی اُس نے ایک دو بار اِس طرح کیا جیسے سامعین سے بھرے ہال میں اچانک کسی کو سٹیج پر کھڑا کر دیا جائے اور اُسے تقریر کرنی پڑے، مگر اِس بار اُسے ہر فنکشن کو ایسے سمجھنا تھا جیسے اُس کی اپنی بنائی ہوئی شے ہو۔ آواز کہاں سے گم کی جاتی ہے، موبائل فوراً بند کس بٹن سے ہوتا ہے، اور فون کر کے اُس میں سے ملائے گئے یا سنے گئے نمبر کا ریکارڈ کیسے ختم ہوتا ہے۔ اگلے دِن عارف اور بچوں کو رخصت کر کے نجمہ

جب کچن کے کام سے فارغ ہو کر غسل خانے گھسی تو اُسے یاد آیا کہ تین چار ہفتوں میں وہ بمشکل ایک بار ہی نہائی ہو گی ورنہ فقط سر دھو کر ہی باہر آ جاتی ہے، سر بھی ایک تو صفائی کی غرض سے اور دوسرے اِس لئے کہ شاید عورت اپنا بھرم قائم رکھنے میں زیادہ حساس ہوتی ہے۔

آج وہ خوب اچھی طرح نہائی۔ دوپہر کو آرام کرنے کی بجائے وہ کافی دیر ٹی وی دیکھتی رہی، پھر ایک میگزین پڑھنے کے لئے اٹھالیا، آج اُسے تکلیف کا احساس کم اور پرانے دِنوں کی طرح مصروف رہنے اور بچوں کا انتظار کرنے میں مزہ آرہا تھا۔

بچوں کو کھانا کھلا کہ نجمہ اُن کے ساتھ ہی لیٹ گئی بچے تو سو گئے مگر وہ کالج کے دِنوں کی یادوں میں کھو گئی، سہیلیوں کے ساتھ ہنسی مذاق، کھانا پینا، نئے نئے پروگرام بنانا نئی آنے والی لڑکیوں کو تنگ کرنا اور مستقبل کے خواب بننا۔۔۔ پھر خیالوں کی دھنک دورماضی کے افق میں گم ہونے لگی اور منظر گڈ مڈ ہونا شروع ہو گیا۔ گھر میں کشیدگی، امی کی فوتگی ابو کی دوسری شادی اور پھر عارف کی بے رخی، خیالوں کی زنجیر کے تسلسل سے اچھے دِنوں کی کڑیاں چھوٹی چھوٹی ہو کر گرنے لگیں اور خزاں کے پتے لمبے ہو کر اجاڑ رستے بن کر اُس کے دِل کے دروازے تک آنے لگے، پتہ نہیں کتنی دیر تک وہ چھت کے ساکت پنکھے پر نظریں جمائے سوچوں میں گم رہی۔

نجمہ کے دِل سے کسی کی سرگوشی کی آواز ابھری، نجمہ تُو تو کسی کا انتظار کر رہی ہے، پھر ہلکی سی ہنسی کی آواز کے بعد دوبارہ سرگوشی ہوئی، نجمہ تو اپنی خوشی کے لئے ایک کے بعد اب کسی دوسرے کی محتاج ہے۔ نجمہ زیرلب بُڑبُڑائی، انتظار کرتی ہے میری جوتی میں تو فون کر کے کھری کھری سناؤں گی اور ذلیل کروں گی۔ نجمہ مجھ

سے کیسا جھوٹ میں تو تیرے اندر بیٹھی ہوں۔ کسی کو ذلیل کرنے کے لئے اتنا تردد، اتنی بے تابی اور انتظار اور دِل میں ایسی امنگ میں نہیں مانتی، سرگوشی ایک بار پھر طنزیہ ہنسی میں بدل گئی۔ نجمہ نے جھنجلاہٹ میں آکر زیرِ لب کی بجائے اونچی آواز میں اپنی سوچ کا جواب دے دیا، ہو سکتا ہے وہ لچر اور بے ہودہ نہ ہو، ہو سکتا ہے تقدیر نے اُسے میری ذلت ختم کرنے کے لئے بھیجا ہو۔۔۔۔

اِس کا مطلب ہے میں ٹھیک اندازہ لگا رہی ہوں، تجھے اُسے بے عزت کرنے کا انتظار نہیں بلکہ اُس میں سہارے کی تلاش ہے۔ نجمہ نے جھٹکے سے اپنی آنکھیں کھول دیں اور دھیرے سے بچوں کے پاس سے اٹھ کر باہر برآمدے میں آگئی۔ کچھ دیر ٹہلنے کے بعد نجمہ کچن کے برتنوں کو ترتیب دینے لگی۔ برتن تو سب پہلے ہی سلیقے سے رکھے ہوئے تھے شاید اُسے کسی برتن کی تلاش تھی۔ کچھ وقت بے مصرف وہاں گزارنے کے بعد برتنوں کی الماری کے پیچھے سے اُسے اخبار کے ایک تہہ شدہ ورق کا کونہ نظر آیااُن کے جھک کر وہ اٹھایااوراُس پر لکھا فون نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کرنے لگی۔

بچوں کو سیپارہ پڑھنے بھیجنے کے بعد نجمہ نے منہ ہاتھ دھویااور برآمدے میں پہلے سے ترتیب سے رکھی ہوئی تپائی اور کرسی پر بیٹھ کر بالوں کو برش کرنے لگی، اُس کی نظریں بار بار بڑے بے چین انداز میں سامنے والے ٹیرس کی طرف اُٹھ رہی تھیں، کچھ دیر بعد نجمہ نے کانپتے ہاتھوں اور زور زور سے بجتے ہوئے دِل کے ساتھ فون ملایااور ایک بار ہیلو کہنے کے بعد چند لمحوں کے توقف اور کپکپاہٹ کے بعد بات کرنے لگی، وہ بات کرتے کرتے ٹیرس پر آچکا تھا، دونوں ایک دوسرے کو

دیکھ بھی رہے تھے۔ قریب دس منٹ بعد جب نجمہ نے زبردستی فون بند کیا تو اُس اجنبی لڑکے کے بارے میں اُس کی رائے بدل چکی تھی، وہ ایک خوش اخلاق شخص تھا، ہاں اُس کی باتوں اور لہجے میں ایک مہارت بھی چھپی تھی جس نے نجمہ کو قدرے کبیدہ بھی کیا لیکن نئی کونپلوں کے گچھے میں ایک کانٹا اتنا بُرا نہیں لگ رہا تھا۔

ہفتہ بھر گزر گیا۔ عارف کا مطالعہ اگلے موڑ پر پہنچ گیا اب اُسے عنقریب باقاعدہ رکنیت ملنی تھی، اُس کے شب وروز میں تبدیلی واضح تر ہو گئی۔ نجمہ نے دلدار سے دِل کی باتیں کہنی اور چھوٹی چھوٹی ضدیں جو فون پر ہی مانی جاسکتی تھیں ماننی شروع کر دیں، دلدار کی طرف سے ملاقات کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا، عارف کی طرف سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ دوسرے شہر جا کر اپنی کاوشوں کی سند لینے کا اشتیاق اپنے عروج پر تھا۔ عارف نجمہ کو'' بھول'' چکا تھا اور نجمہ بچوں کو اتنا بڑا سمجھنے لگی تھی کہ جیسے اب انھیں سنبھالنے کی ضرورت نہیں رہی۔

اُس دن عارف نے سٹور سے واپس آتے ہی کہا۔۔۔ نجمہ میں کل سہ پہر کو دو دِن کے لئے اپنے دوستوں کے ساتھ لاہور جاؤں گا۔ ذکر اذکار، مطالعہ ریاضت اور جو کچھ پڑھا ہے اُس کا امتحان ہو گا، اتوار شام کو انشاءاللہ میں گھر واپس آ جاؤں گا۔ مجھے عجیب سا لگ رہا ہے پہلی بار رات بلکہ دو راتیں گھر سے باہر گزارنے جا رہا ہوں مگر جانا بھی اشد ضروری ہے۔ نجمہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اُسے عارف کے اِس طرح رسمی اطلاع دینے پر ہونے والا افسوس شدید ہے یا دلدار سے ملاقات کا

موقع ملنے کی خوشی بڑھ کر ہے ۔ ایک تجسس موج زن تھا، بہت سی باتیں سرگوشیاں، چھیڑ چھاڑ اور اپنی بہت سی تعریفیں سننے کا ابھی سے مزا آنے لگا تھا۔

آج عارف نے واپس لوٹنا ہے۔ نجمہ نے انتہائی سلیقے سے گھر کو صاف ستھرا کیا اور ہر شے خصوصاً ڈرائنگ روم کے صوفے کو تین چار بار چاروں طرف سے انتہائی باریک بینی سے دیکھا پھر اپنے کمرے میں آئی اور اپنی الماری کھول کر رنگین کاغذوں میں لپٹی ہوئی چند چیزیں اور اپنا موبائل فون نکال کر فون بند کرتے ہوئے انھیں کچن کی الماری میں رکھ کر تالا لگایا۔ ایک بار پھر گھر کا جائزہ لینے کے بعد نجمہ نے نہانے کا ارادہ کیا۔ گزشتہ دو راتوں میں وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہ سو سکی تھی آج بچوں کو سکول سے چھٹی ہونے کی وجہ سے اُسے دن کو بچوں کے ساتھ کچھ دیر سونے کا موقع مل گیا تھا مگر ابھی تک نیند کا خمار مکمل طور پر نہیں اترا تھا۔ سارا بدن ٹوٹ رہا تھا مگر انگ انگ میں بسا لمس کا احساس اور تعریف کی تسکین انگڑائیاں لے لے کر باہر آ رہی تھی۔ نہاتے وقت اُس کی نظر اپنے جسم پر پڑی تو ساری رات اُس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی وہ سر سے پاؤں تک مہکنے لگی، جسم گیلا ہونے کے باوجود تپنے لگا۔ نجمہ نے جسم کے ایک دو حصوں پر صابن نسبتاً زیادہ دیر ملا مگر نشانات مٹنے کی بجائے زیادہ واضع ہو گئے، کپڑے پہنتے ہوئے وہ نشانات کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔ کمرے میں آکر اچانک اُس کے ذہن میں کوئی خیال سوجھا اُس نے الماری کھول کر بچوں کے زخموں پر لگانے والے پلاسٹر نکالے اور انھیں اپنے جسم کے نشانات پر چپکا دیا۔ اِس کام سے فارغ ہو کر نجمہ بیڈ پر بیٹھی اور مہ نور اور صفدر کو جو سو رہے تھے پیار سے دیکھنے لگی، ہائے اللہ صرف دو راتیں اپنے جگر

کے ٹکڑوں کو اپنے کلیجے سے لگا کر نہیں سوئی تو معلوم ہوتا ہے سالوں گرز گئے ہیں اِن کو سینے سے لگائے ہوئے حالانکہ میں کون سا کہیں دور چلی گئی تھی یہ ساتھ ڈرائنگ روم میں ہی تو تھی۔ وہ بچوں کو پیار کر کے باہر آ گئی ابھی کچھ کام رہتے تھے۔

مغرب کی اذان سے کچھ دیر پہلے دروازے پر دستک ہوئی، بچے کچن میں بسکٹ کھا رہے تھے، نجمہ نے دروازہ کھولا، سامنے عارف کھڑا تھا اُس نے اندر داخل ہوتے ہوئے سپاٹ سے لہجے میں کہا، دروازہ پوچھ کر کھولا کرو، کیا معلوم کون ہو۔ جی اچھا جی، نجمہ نے انتہائی موٗدب لہجے میں جواب دیا۔ بچوں سے پیار کر کے عارف کچن سے نکل کر کمرے کی طرف آیا تو اُس کی نگاہ گھر کے بدلے ہوئے نقشے پر پڑی گھر بہت پہلے کی طرح مکمل طور پر صاف ستھرا تھا، برآمدے کے کونے میں جائے نماز بچھی ہوئی تھی، دیوار پر کیل کے ساتھ عارف کی نماز کی ٹوپی اور تسبیح لٹک رہی تھی، برآمدے اور کمرے کے اندر لگی ہوئی دونوں تصویریں غائب تھیں، عارف کے بیڈ کے پاس الماری میں عارف کی تمام کتابیں بڑے سلیقے سے لگی ہوئی تھیں اور نجمہ کی کتابیں پیچھے کر کے ڈھانپ دی گئی تھیں۔ عارف بیڈ پر بیٹھا تو نجمہ نے نیچے بیٹھ کر جلدی سے اُس کے جوتے اتارنے کے لئے ہاتھ بڑھائے، نجمہ عارف کے جوتے اتار رہی تھی اور وہ اُس کے سر پر چاروں طرف سے اچھی طرح سے لپٹے ہوئے سکارف کو دیکھ رہا تھا۔

جوتے اتار کر نجمہ کچن میں گئی اور دو منٹ کے اندر چائے کی پیالی عارف کے سامنے تھی، آپ چائے پیئیں اور ساتھ ساتھ مجھے اپنے سفر کے بارے میں بتائیں، عارف

سب کچھ بھول کر نجمہ کو اُسی انداز میں باتیں سنانے لگا جیسے سٹور پر دِن بھر ہونے والی دلچسپ باتیں بتایا کرتا تھا۔ کچھ دیر بعد نجمہ نے بات کاٹی میں تو وضو میں ہوں مگر آپ وضو کر لیں نماز کا وقت ہونے لگا ہے باقی باتیں کھانے پر کریں گے۔ نجمہ قمیض کے گلے کے آگے ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے بولی اور کچن کی طرف چلی گئی۔ عارف طمانیت سے نجمہ کو دیکھ رہا تھا۔

اختتام



بازیافت

Bazyaft Digital Publications